آفریں بر تو فدائی یاد و ہندوستاں
خامہ را شیریں بیانی صفاہاں دادئی

فدائی

یعنی

جناب مولوی شاہ محمد عثمان صاحب فاروقی فدائی رحمۃ اللہ علیہ
وکیل جونپور کی فارسی اور اردو کی تصانیف سخن کا مجموعہ

مرتبہ

شاہ محمد سلمان بی۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل

مع مقدمہ

از علامہ کیفی چریاکوٹی

مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

(محمد احید الدین ایف۔ آر۔ ایس۔ اے پرنٹر)

۱۹۳۳ء



مولوي شاه محمد عثمان صاحب فاروقی فدائی

۷۸۹۶

تمہید

دیوان فدائی (مجموعہ کلام فارسی و اُردو جناب والد ماجد قبلہ وکعبہ مولوی شاہ محمد عثمان صاحب مرحوم) جس کے سلسلہ ترتیب اشاعت کو برادر مکرم جناب آنربل چیف جسٹس سر شاہ محمد سلیمان صاحب زاد مجدکم نے ۱۹۲۰ء میں والد قبلہ کے انتقال کے بعد ہی اپنا فرض منصبی سمجھکر انجام دینا چاہا اور اپنے قیمتی وبیش بہا وقت کو علمی وادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ نسخہ جات کے مہیا کرنے اور اوراق پریشاں کو ایک مجموعہ کی شکل میں ترتیب دینے میں صرف کرنے لگے مجموعہ کلام چونکہ منتشر اوراق کی صورت میں وقتاً فوقتاً دستیاب ہوا لہذا برابر یہی اندیشہ رہا کہ شائد وہ بزم ادب میں بذات خود اپنے تعارف کے لیے کافی نہ ہو اس لیے تکمیل اشاعت میں ضرورت سے زیادہ تاخیر ہوتی رہی۔

اس عرصۂ درازکی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ نسخہ جات کا ذخیرہ موجودہ حجم تک پہنچا جو ایک دیوان کی شکل میں ارباب سخن سنج وناظرین مع الکرام کی خدمت میں پیش ہے۔

والد مرحوم کو اپنے کلام کی نہ اشاعت منظور تھی اور نہ یہ خواہش تھی کہ مشاہیر سخن کے زمرہ میں اُن کا نام مشہور ہو۔ انتہائی جذبات سے متاثر اور فطرت سے مجبور ہو کر شعر کہا کرتے تھے اس لیئے مجموعہ کلام دیرینہ و پارینہ نظرثانی سے مستفید نہ ہو سکا۔

مبصر الانصاف اس مختصر مجموعہ کلام کو اگر اصلی معنوں میں صحیح جذبات کا نمونہ تصور کرلیں تو
ممکن ہے کہ موجودہ خامیاں جو کلام پر نظر ثانی نہ ہونے کی وجہ سے رہ گئی ہوں نظر انداز ہو جائیں
حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی غزل پر ایک تضمین اردو کلام کے سلسلہ میں اشاعت
میں آچکی ہے لیکن والد مرحوم کی تحریر میں نہیں پائی گئی لہذا یہ دعوے سے نہیں کہا جا سکتا
کہ مرحوم کی تصنیف ہے یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

برادرم مکرم کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس مجموعہ کی طباعت و اشاعت کا خوش گوار
فرض مجھے ادا کرنا پڑا اس سلسلہ میں میں نے اپنا پہلا فرض یہ سمجھا کہ جہاں تک ممکن ہو مجموعہ
کلام کتابت کی غلطیوں سے پاک رہے اور باقی ماندہ سرمایہ سخن ضائع نہ ہو بلکہ دیوان
کی صورت اختیار کرلے معلوم نہیں کہ اس فرض گزاری میں کہاں تک مجھے کامیابی نصیب ہوئی
آخر میں مجھے عزیزم علامہ کیفی چریاکوٹی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے جو سلک تحریر
میں آنے سے قاصر ہے۔ مختصر یہ کہ علامہ موصوف نے انتہائی کوشش اور جاں فشانی سے والد
مرحوم کی سوانح عمری فراہم کی اور مستند اور مدلل طور پر اپنی سحر طرازی و جادو بیانی سے
مقدمہ کو حسن عقیدت کے پیرایہ میں رنگ دیا جو دیوان کا جز و لاینفک ہو گیا

خاکسار

سلمان (وکیل)

الہ آباد

۲۷ رجب ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء

مُقدّمہ

حالات وسوانح

از خامشی کشودہ نہ شد قفلِ دلِ ما
شد وقت آنکہ از جگر افغاں برآوریم

جس طرح انسان اپنے ادراک اور نطق کی وجہ سے غیر انسان پر فضیلت رکھتا ہی اسی طرح انسان کی خاص اور ممتاز ہستیاں عوام پر تفوق اور امتیاز رکھتی ہیں، آسمان کی سیکڑوں گردشوں زمانے کے ہزاروں کروٹوں کے بعد بساطِ ارضی پر ایک ایسا انسان پیدا ہوتا ہی جس کی پیشانی عطایائے ربّانی کا آئینہ، جس کا دماغ اسرار فضل و کمال کا خزانہ اور دل رموز و نکات کے موتیوں کا بحر بے پایاں ہوتا ہی، اس کا ہر اشارہ عجائباتِ فطرت کی شرح اس کی ہر حرکت حیاتِ جاوید کی تفسیر اس کا ہر قدم ابتدائے عزم اور انتہائے منزل ہوتا ہی ؎

بیک ایمائے ابرو زندۂ جاوید گردیدم
اشارت سوئے من کردی ہلالِ عید گردیدم

البتہ ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیئے بصارت اور بصیرت کی شمع درکار ہوتی ہے

تو اوّل خویش را دریاب تا او را بجا یابی

انھیں پیکرانِ فضل و کمال مجسمۂ فراست و ذکا میں مصنّف کلام فدائی کا نمایاں وجود اور درخشاں نام ہے

نام اور خاندان

مصنّف کا نام (مولوی) شاہ محمد عثمان فاروقی (رحمۃ اللہ علیہ) تھا، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت فاروق اعظمؓ تک پہونچتا ہے اس لیئے آپ کے آباؤ اجداد شیوخِ فاروقی کہلاتے ہیں۔

آپ کے "جد" حضرت مخدوم عیسےٰ تاج سلطنت شرقی کے زمانے میں دہلی سے جونپور آئے دہلی اس خصوصیت میں عرصہ سے ممتاز ہے کہ ہندوستان کی زمین کو فیوض و برکات سے مالا مال کرنے والی ہستیاں عرب و عجم سے آکر اپنی پہلی منزل اسی کو بناتی تھیں پھر وہاں سے حسب استطاعت کسب نعمت الٰہی ہندوستان کے مختلف حصّوں میں پھیل جاتی تھیں، گویا کہ "دہلی" شموسِ کمال کا مطلع تھی اور تمام ہندوستان ان کی شعاع اور تابانی کے لیئے فضا تھا

حضرت مخدوم صاحبؒ جب جونپور آے تو سلطنت کی طرف سے مستقل جاگیر نذر

ہوئی پھران کے ورثا میں سے حضرت مخدوم بندگی شیخ محمد معروف جونپور سے منتقل ہوکر موضع ولید پور (ضلع اعظم گڑھ) میں تشریف لائے اور وہیں آباد ہو گئے اس موضع کو دریائے ٹونس نے بالکل جزیرہ نما بنا دیا ہے، اس وقت سے یہ موضع مشائخ کبار کا عرصہ تک مرکز رہا ہے۔

حضرت مخدوم صاحبؒ جب ولید پور پہونچے تو ان کے دامن توکّل کو خدا کی میرسامانی کے اشارے سے شاہانہ عطائے جاگیر نے بھر دیا۔

ان کے تین فرزند تھے ۱۔ مخدوم شیخ علی ۲۔ شیخ خضر ۳۔ شیخ ابوسعید

مخدوم شیخ علی لاولد تھے۔ شیخ خضر کی اولاد میں مُلّا محمود صاحب شمس بازغہ آفتابِ فضل و کمال مشہور ہیں، ان کی بہن کی اولاد میں مولوی حافظ عابد حسین مرحوم مشہور وکیل جون پور مصنّف کے سسر تھے۔

شیخ ابوسعید کی اولاد میں مصنّف کے والد ماجد شاہ خادم علی رحمۃ اللہ علیہ تھے یہ بھی نامی وکیل تھے اور غدر ۱۸۵۷ء کے پہلے ان کی وکالت کو فروغ تھا لیکن بعد چندے وکالت ترک کر کے خانہ نشین ہو گئے تھے۔

حالاتِ مصنّف

مصنّف اپنے والد ماجد کے تین بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے، ان کی

ولادت مقام آستانہ بھیرا موضع ولید پور کے ایک حصے میں دسمبر سنہ ۱۸۶۰ء مطابق سنہ ۱۲۷۷ھ میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم موضع سلیم پور ضلع غازی پور میں مولوی عبد اللہ سب جج و رئیس غازی پور کے مکان پر ہوئی

تعلیم

ابجد خوانی کے بعد درس نظامیہ کی ابتدائی کتابیں مولوی حفیظ اللہ صاحب مرحوم فتح پوری سے پڑھیں چونکہ مصنف کا ذہنِ رسا، خداداد ذکاوت کا دریا صرف اسی ساقی کا کاربند ہونا اپنی تنگ ظرفی سمجھتا تھا، اس لیئے اس کی تکمیل مشہورِ زمانہ استاد عقلیات مولانا ہدایت اللہ خاں مرحوم رامپوری سے کی شفیق استاد کی دوربیں نگاہوں نے ستارۂ بلندی و اقبال شاگرد کی پیشانی پر دیکھ لیا تھا اس لیئے کمالِ شفقت سے پڑھایا، ہونہار شاگرد نے فلسفہ اور منطق میں جو کچھ کمال حاصل کیا اس کو آخر عمر تک امتیاز کے ساتھ نہ صرف نباہا بلکہ چمکایا۔

مصنف کی سب سے بڑی دوربینی یہ تھی کہ اُنھوں نے منطق اور فلسفہ کو مفید اور کارآمد بنانے کے لیئے وکالت کو تجویز کیا چنانچہ دنیا نے دیکھا بھی کہ فلسفہ اور منطق کے سایہ میں وکالت نے کتنا فروغ پایا اور وکالت کس مرتبہ رفیع و بلند پر پہنچ گئی۔

وکالت

مصنف نے مولوی حافظ عابد حسین مرحوم کے ایسے نامور عالی دماغ مشہور روزگار وکیل سے ۱۲۹۹ھ میں قانون پڑھنا شروع کیا، ۱۸۸۲ء میں منصفی کی وکالت پاس کی ایک یا دو سال بعد ۲۴ سال کی عمر میں ان کی شادی مولوی صاحب کی دختر نیک اختر سے ہوئی اس کے بعد ہی یعنی ۱۸۸۶ء میں ججی کی وکالت پاس کر کے کامیابی کے ساتھ اپنے پیشے میں منہمک ہو گئے۔ خاندانی ذکاوت، ذاتی ذہن کے ساتھ فضل وکمال اس پر منطق کی حجت آفرینی اور فلسفے کی نظر عمیق وکالت کو ایسا موجِ طوفاں بنا دیا جس کے سامنے کوئی چیز ٹھہرنے کی تاب نہ لا سکتی تھی۔

مصنّف کے دامنِ مناسب ووسیع کو قدرت نے اور عطایا کے ساتھ، قوت گویائی، زور تقریر، بذلہ سنجی، خطابت، حاضر جوابی، قیامت کی سوجھ بوجھ سے بھی بھرا تھا۔

لَیْسَ لِلّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

یہ سب چیزیں مجموعی طور پر اگر کسی ذاتِ واحد میں جمع ہو جائیں اور پھر اس کی ترقی اور اقبال کا جو تصوّر عقل پیش کر سکتی ہو وہ سب مصنّف میں موجود تھیں۔

اس وقت عام طور پر یہ مشہور تھا کہ "بڑے سے بڑے وکلا ان کے سامنے ٹھہرنے کی تاب نہیں لاتے"۔ انھوں نے انگریزی باضابطہ پڑھی نہیں تھی لیکن ان کی طباعی اس کی

چنداں محتاج بھی نہ تھی، ان میں جس قدر قوت گویائی تھی اس سے زیادہ زورِ تحریر تھا چنانچہ ان کے بیان تحریری کی شان اور پرمغزی اس میں عجیب و غریب قانونی نکات کی فراوانی اب تک مشہور ہے۔

اِن کا مستقر جون پور تھا لیکن مقدمات کی پیروی میں دور دور بلائے جاتے تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی گرہوں کو قابلیت اور طبّاعی کے ناخن سے چٹکیوں میں کھول دیتے تھے، وہ عرصہ تک کامیابی اور شہرت کے ساتھ وکالت کرنے کے بعد بیمار رہنے لگے، اور آخر عمر میں جونپور سے باہر ریلوے اسٹیشن ظفرآباد کے متصل ایک بنگلے میں قیام کرلیا تھا اسی اثنا میں ہاتھ میں درد پیدا ہوگیا جو عرصہ تک بہت تکلیف دہ تھا اس کا اشارہ جا بجا اپنے اشعار میں کیا ہے۔ بیماری کا سلسلہ دو برس تک قایم رہا۔ ۱۴ مہینے مسلسل بیمار رہے، جگر خراب ہوگیا، لکھنؤ میں کچھ دنوں حکیم خواجہ کمال الدین صاحب کے زیر علاج رہنے کے بعد الہ آباد تشریف لائے اور اپنے بڑے صاحبزادے (آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب بیرسٹرایٹ لا موجودہ چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ) کے ساتھ قیام پذیر ہوئے اور بڑے بڑے اطبا اور ڈاکٹروں کے عرصہ تک زیر علاج رہے یہاں تک کہ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ء روز شنبہ ۲ بجے شب کو بہ اقتضائے ؎

کسے کہ زاد بنا چار بایدش نوشید

زجام دہر مے کل من علیہا فان

داعی اجل کو لبیک کہا، اور مدفن گلاب باڑی متصل دایرہ شاہ اجمل بخشی بازار میں مدفون ہوئے قبر پختہ بنی ہی اور سر لوح مصنف ہی کا قطعہ تاریخ بہ ادنیٰ تغیر کندہ ہی۔

مرحوم نے باقیات صالحات میں ایک صاحبزادی اور چار صاحبزادے چھوڑے سب سے بڑے صاحبزادے آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب چیف جسٹس ہیں دوسرے شاہ محمد سفیان آبائی جائداد کے منتظم ان سے دونوں چھوٹے مولوی شاہ محمد سلمان بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی اور مولوی شاہ محمد حبیب بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی ہیں، اول الذکر الہ آباد میں کئی سال سے وکالت کر رہے ہیں، آخر الذکر نے ابھی پاس کیا ہی اور کام شروع کیا ہی۔

عادات و اخلاق

مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے متواضع، سیر چشم، اقربا پرور، دوست پرست اور سخی تھے حلقہ احباب اتنا وسیع تھا کہ اس کی وسعت مشکل سے نظر میں سماتی تھی اس میں قریب قریب ہر طبقہ شامل تھا، اخلاق کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہی کہ ہر طبقے کا ہر شخص یہ سمجھے کہ التفات اور مروت کی نظر سب سے زیادہ مجھ پر ہی، خدا غریق رحمت کرے مولوی صاحب اسی قسم کے اخلاق کا مجسمہ تھے۔

اخلاق کی ہمہ گیری کا بلند ترین مرتبہ یہ ہے کہ ایک ہی شخص شعرا میں شاعر سخن سنج، علما میں عالم زبردست، ادیبوں میں نکتہ داں، بذلہ سنجوں میں لطیف المزاج لطیفہ گو ہو۔ مولوی صاحب ان اوصاف میں اپنی آپ مثال تھے۔

وہ اپنے دوستوں کے صرف دوست نہ تھے بلکہ ان کے خاص معتمد رازدار، اور وہ اس کے جواب میں ان کے شیدا تھے۔ مولوی محمد مصطفےٰ آثم ولید پوری مغفور مولوی صاحب علیہ الرحمہ کے خاص دوستوں میں تھے۔ مولوی صاحب نے اکثر مواقع پر ان کے ساتھ اپنی دوستی کا ایسا ثبوت دیا جس کی مثال عرصہ سے مفقود ہے۔

وہ بڑے نسّاب اور پابند عصبیت، غیور اور پرانی وضع کے دلدادہ تھے ان کا خاندان علم فقر و تصوّف میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے خدا نے اسی کے توکل کی پوری کفالت کی تھی اس لیئے یہ خاندان دنیا سے بے پروا ہو کر استغنا کی زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن مصنف کی رواداری، غربا پروری اور غربا نوازی سے کبھی بے پروا نہیں رہا۔

علم و ادب کا ذوق

بڑے بڑے علما اور شعرا، اہل قلم اور ادیبوں کی مجالس میں ان کو شرکت کا موقع ملا اور اس میں ان کی طبّاعی اور رسائیِ ذہن ممتاز صورت میں نمایاں رہی۔

اکثر علما سے مسائل علمیہ میں مناظرے اور مباحثے ہوئے اور اس میں مولوی صاحب نے

اپنا خدا داد امتیاز قایم رکھا۔

عام طور پر وہ تمام اہل کمال کے گرویدہ تھے خصوصیت سے علمائے چریاکوٹ بالخصوص شیخ المشیوخ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور ان کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریاکوٹی، مولانا نجم الدین چریاکوٹی، مولانا علی عباس چریاکوٹی رحمۃ اللہ علیہم کا بڑا احترام کرتے تھے۔

فارسی شعرائے متقدمین میں جامی، حافظ اور متاخرین میں حزیں کے بہت مداح تھے، چنانچہ ان کی فارسی کی غزلیں بیشتر انھیں کے نقش قدم پر ہیں جابجا جامی اور حافظ کی طرف اشارہ بھی کیا ہے ان کی بعض غزلوں پر غزلیں اور بعض پر تضمین لکھی ہے۔

اُردو شعرا میں حکیم مومن خاں مومن دہلوی اور مولانا آسی سکندرپوری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے دلدادہ تھے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''مومن کے کلام کی طرف ملک کی بے توجہی اس کی بد مذاقی کی دلیل ہے،، اس میں ان کو اس قدر غلو تھا کہ ان کی فرمایش سے خاکسار مقدمہ نگار (کیفی چریاکوٹی) نے سب سے پہلے مومن کے کلام کی شرح اپنے ماہانہ رسالہ ''العلم،، میں لکھنی شروع کردی تھی، اس کے بعد پھر ملک کو توجہ ہوئی اور ''مومن،، کے کلام پر بکثرت مضامین شایع ہوئے۔

اہل قلم میں نواب عماد الملک کے بہت معترف تھے۔ اُردو میں سرسید کی سادگی

اور حالی کے قوم پرستانہ جذبات کے قائل تھے۔

عقیدہ اور مذہب

وہ ایک راسخ العقیدہ حنفی اور سُنّی تھے لیکن انھوں نے کسی مذہب کی کبھی مخالفت نہیں کی، وہ فرمایا کرتے تھے کہ "مذہب اخلاق کی درستی کا نام ہے"

وہ اقوال کے مقابلے میں اعمال کے قائل تھے، فرماتے تھے کہ "ایفائے عہد اور راستی مذہب کے دو درخشندہ گوہر ہیں، عقیدے کی استقامت اور مذہب کی پابندی کا ان صفتوں سے پتہ چلتا ہے۔

حلیہ و لباس

میانہ قد، گورا رنگ، بلند پیشانی، ہنستا ہوا چہرہ۔ آنکھوں سے دوراندیشی اور دوربینی کا پتہ چلتا تھا جیسا کہ تصویر سے صاف نمایاں ہے لباس میں سادگی اور صفائی کو بہت پسند کرتے تھے۔

بعض خصوصیات

ان کو جھوٹ سے بہت نفرت تھی، دغا اور فریب کو "ایمان کی موت" کہتے تھے شطرنج کا بہت شوق تھا اور اس میں ان کو کمال بھی تھا، کبھی شعر و سخن کی محفل گرم ہو جاتی تو گھنٹوں قایم رہتی، فارسی اور اردو کے بہترین اشعار بکثرت یاد تھے موقع موقع سے پڑھتے تھے

اور خاص لطف لیتے تھے۔

کسی کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو کھلم کھلا سرزنش نہ کرتے بلکہ اکثر خاموش ہو جاتے اپنے کسی ہنر اور وصف کا کبھی ذکر نہ کرتے، اظہار اور تصنع سے بہت دور رہتے، چنانچہ اُنھوں نے اپنی کوئی غزل یا نظم طلبِ شہرت میں شایع نہیں کی حالانکہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی فارسی کی غزل خاکسار مقدمہ نگار نے اپنے ماہانہ رسالہ العلم میں شایع کی تھی اس پر اُنھوں نے ان الفاظ میں اظہار ناخوشی کیا کہ "تم میری مرضی کے خلاف مجھ کو پبلک میں لائے" وہ غزل اس مجموعے میں ہی اور بہت بہتر ہی۔

وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور ان کی اولاد کو خوش حال اور ترقی کے زینے پر دیکھ کر بہت خوش ہوتے بلکہ اکثر اس میں مدد دیتے، خاکسار مقدمہ نگار بھی ان کے اسی قسم کے کرم کا ممنون ہی۔ خدا ان کی روح پر اپنی رحمت کاملہ اور رضائے خاص نازل فرمائے۔

جو خصوصیت ان میں خاص طور پر نمایاں تھی وہ دل کا گداز لطیف ترین احساس اور بلند ترین ادراک کی فراوانی تھی یہی چیزیں انسان کو ادبیات کے بلند ترین مقام پر پہونچا دیتی ہیں چنانچہ مصنف علیہ الرحمہ اس کی ایک مثال تھے اس کا تفصیلی ذکر آگے آتا ہی

ادبیات اور مصنف

عام طور پر مشہور رہی کہ علوم ظاہری کا ماہر منطق اور فلسفہ کی خشک زمین کا مالک، فنونِ ادب کے چمن کا باغبان بن نہیں سکتا، اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہی کہ فنونِ ادب کی لطافت بہار ہی اور اکتسابی علوم اس کے مقابلے میں خزاں کا حکم رکھتے ہیں خزاں اور بہار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

اس حجت اور دلیل کی حقیقت چاہے جس قدر قابل تسلیم ہو لیکن حقیقت عمل کے سامنے ان کی کوئی وقعت نہیں مصنف کی طبع رسانے دونوں اقلیموں کو ایک ساتھ فتح کر کے دونوں کا ڈانڈا ملا دیا تھا،

سابق سطور میں آپ نے حالات کے سلسلے میں "علم و ادب کا ذوق" ایک ساتھ دیکھا ہی، آیئے اب آپ کو اس ذوق ادب کے وہ نقش و نگار دکھا دیں جن کو انقلاب دہر اور مرور ایّام کے ہاتھ کبھی مٹا نہیں سکتے۔

ادبیاتِ نثر

جس طرح آفتاب بادلوں میں، شمع، پردہ دامن میں غائب اور معدوم نہیں ہو سکتے اسی طرح ادب کی شادابی کو زمین کی ویرانی اور افتادگی زائل نہیں کر سکتی ادب وہ شیرینی ہی جو تلخی میں مل کر اس کو بھی شیریں اور گوارا بنا دیتی ہی۔

مُصنّف مغفور نے کبھی نثر کا کوئی مضمون نہیں لکھا لیکن ان کی عام تحریروں خطوط معمولی رقعوں میں یہاں تک کہ بیانات تحریری اور عرضی دعووں میں اس کا نظر نواز اور دل فریب عنصر موجود ہی، ان کی ادب نمائی خشک سے خشک مضمون اور روکھے سے روکھے موضوع کو دل نشین اور دلچسپ بنا دیتی تھی، ہم کو اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرنا نہیں ہی تاہم اپنے دعوے کے ثبوت میں ہم ایک خط کی نقل پیش کرکے اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ و علے ہذا

مجیم۔ السلام علیکم۔ دسمبر کی تعطیل میں مکان گیا تھا، باوجود احتیاط، ریل کے اوقات کی خرابی کی وجہ سے، سردی اثر کر گئی، اس لیئے درد پارینہ عود کر آیا، اب تک اسی تکلیف میں مبتلا ہوں بغرض علاج لکھنؤ جانے کا ارادہ ہی کچھ موانع ہیں، دیکھیئے کب تک جاتا ہوں، اس طرف آپ کا کچھ حال معلوم نہیں ہوا تعلق ہی، مُلّا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غزل جس کا مطلع درج ذیل ہی بہت پسند آئی ؎

پئے تسکین جامی بوسہ بخش

کہ امروزش دگرگوں می تپد دل

اس شعر نے مجھ پر ایک کیفیت طاری کر دی، میں نے بھی اس پر ایک غزل لکھی ہی اس کے چند اشعار نذر کرتا ہوں خیریت مزاج سے اطلاع دیجیئے ہاتھ کے درد کی وجہ سے

خود لکھنے میں تکلیف اور تکلّف ہی اس لیئے دوسرے سے لکھوایا ہی۔

۱۱ر جنوری ۱۹۱۶ء

(شاہ) محمد عثمان

یہ خط مولوی محمد مصطفےٰ صاحب آثم کے نام ہی، پوری غزل مجموعے میں موجود ہی؛ غزل میں جو کچھ ہی اس کی جگہ دیکھیئے، عبارت نثر میں جو سلاست، روانی اور ادب کا جس قدر پہلو ہی یہاں دیکھ لیجیئے

ادبیات نظم فارسی

آجکل فارسی دانی اور فارسی گوئی کا جو معیار ہی اس نے فارسی کی عذوبت کو برباد اور اس کے صحیح معیار کو تباہ کر دیا ہی، عام طور پر اردو خواں شعرا نے فارسی کو مشق ستم کیلیئے جسطرح جولانگاہ بنایا ہی اس کے سامنے صحت مذاق کو کون پوچھتا ہی لیکن مصنف علیہ الرحمہ نے فارسی میں جو کچھ کہا ہی یا جو کچھ لکھا ہی وہ اپنی جگہ محاورات، مصطلحات۔ زبان۔ خوبی ترکیب بلند پایگی، طرز بیان کے اعتبار سے سند ہی ان خصوصیات کو علحدہ علحدہ جانچ لیجیئے تو ان کی فارسی دانی کا اعلیٰ معیار سمجھ میں آجائے گا۔ فارسی اور اردو دونوں میں فدائی، تخلص کرتے تھے لیکن ہر نظم اور ہر غزل میں اس کے اظہار اور ذکر کے سختی سے پابند نہ تھے۔

محاورہ بندی

ایک غزل کا مطلع ہے

مستِ الست بادۂ دوشینہ نوش کن
ایں جانِ زار نذرِ موو می فروش کن

دوسرے مصرعہ میں "نذر مو و می فروش کن"، نذر کردن و بردن اہل زبان اساتذۂ فارسی کا محاورہ ہے چنانچہ ظہوری نے لکھا ہے:۔

یک شعلہ تا ز جیب نفس سر بر آوردم
صد داغ نذر سینہ پروانہ بردہ ایم

نذر کردن ظہوری کا شعر ہے:۔

سخنہا وقفِ گفتارِ تو کردیم   نظرہا نذر دیدار تو کردیم

جلال اسیر نے کہا ہے:۔ ع

شمع آہے کردہ ام نذر شہیدان بہار

سالک یزدی کا مصرعہ ہے:۔ ع

نفسے چند اگر نذر گلستاں نہ کند

جن لوگوں نے نذر کردن کے محاورے پر اعتراض کیا تھا غالباً ان کی تسکین کے لیے

اس قدر کافی ہی کہ جامی کی غزل پر جو غزل لکھی ہی اس کا ایک شعر ہی:۔

چو مُرغ قبلہ رو دارم بہ کوشش

مرا در سینہ افزوں می تپد دل

پہلے مصرع میں "رو داشتن کے معنے مشغول ہونے کے ہیں، یہ محاورہ بھی خاص

اہل زبان کا ہی آقا شاپوری کا شعر ہی:۔ ؎

نقابے بر رخ افگن یا رکشتِ گلستاں بگذر

کہ سنبل سخت در تابست و گل بسیار رو دارد

پابندی اصطلاحات

حافظ کی غزل پر خمسہ لکھتے ہیں اس کا پہلا مصرعہ اس طرح ہی:۔

"الا یا ایہا المطرب بکن سازے انا ملہا"

"ساز کردن" کے معنے آمادہ اور مستعد کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہی کہ "ای مطرب تو

اپنی انگلیوں کو آمادہ کر" مطرب کا انگلیوں کو آمادہ کرنا یا ساز کرنا بہت ہی لطیف پیرایہ

بیان اور دلچسپ مقصد آہنگ و سرود ہی اسی خمسے میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

بہ دریائے تعشق دست و پائے می زنم باطل

چناں باد مخالف تند کہ سعیم کرد لا حاصل

پہلے مصرعہ میں "تعشق" کا لفظ "محبت" کے مقابلے میں قصداً لائے ہیں کیونکہ اس میں "باب تفعل" کا تصنع اور تکلف شامل ہے، اسی کو باد مخالف تباہ بھی کرسکتی ہے، یہ عارف کی اصطلاح ہے اس لطیف پیرائے کو ہر شخص نہیں پا سکتا۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔ ؎

مرا در عیش مستی بر درِ میخانہ دید آخر

"عیش مستی" اہل زبان کی اصطلاح ہے جو اہل زبان نہیں وہ خدا جانے "عیش" کی جگہ جوش یا کیا لکھتے ؟

زبان

ایک غزل میں لکھتے ہیں:۔ ؎

توبہ شکستم بہ شکست سبو　　　　محتسبم فالِ فلاحم بداد

پہلا مصرعہ لطف زبان کی نادر مثال ہے۔

دوسری جگہ ایک غزل کے اکثر اشعار میں زبان کا جادو دکھاتے ہیں، اس کا ایک شعر یہ ہے:۔ ؎　　شنیدستم کہ مستی غم رباید

من آں مستم کہ افزوں می تپد دل

کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ "مستی" غم کو دور کرتی ہے لیکن میں وہ مست ہوں کہ میرا دل

اور زیادہ تڑپ رہا ہی۔

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:۔ ے

در ابروئے تو شکن نہ زیبد

شمشیر تو بے نیام خواہم

اِس شعر میں لطف زبان کے ساتھ ندرت مضمون کی بھی اعلیٰ شان ہی، کہتے ہیں "تیرے ابرو پر شکن اچھی معلوم نہیں ہوتی، تیری آنکھیں تلوار ہیں تو اس تلوار کا غلاف سے باہر ہی رہنا مجھ کو پسند ہی" شکن کو نیام سے تشبیہ دینا طبع رسا کی ایسی لطافت ہی کہ یہاں تک پہنچنا ہر دوربینی کا کام نہیں۔ مجموعہ کلام میں اس قسم کی مثالیں بکثرت ہیں۔

خوبی ترکیب

فدائی علیہ الرحمہ اس میدان میں بھی اکثر شعرا سے بہت آگے ہیں۔ مثلاً ایک غزل کا مطلع ہی:۔ ے

ساقی! مئے لعل فام خواہم

می خواہم و ہاں مدام خواہم

اے ساقی! سُرخ رنگ کی شراب چاہتا ہوں (سن) شراب چاہتا ہوں (دوسری چیز نہیں) اور ہاں ہمیشہ کے لیئے چاہتا ہوں۔

ترکیب کی خوبی یہی ہی کہ کثیر معنی قلیل الفاظ میں سما جائیں۔ "مدام" کے دوسرے

معنے شراب کے ہیں عربی میں ایک خاص قسم کی شراب کا نام ہے، فارسی شعرا نے عام شراب کے معنے میں استعمال کیا ہے یہ لفظ جہاں کہیں آیا ہے وہاں اسی طرح کہ اس میں "شراب" کے ساتھ ہمیشگی کے معنے پیدا ہوں اور پھر لطیف پیرائے میں ایک ہی لفظ سے "مداومت شراب" کے مطلب ادا ہو جائیں، فدائی کا ذوق طبع اس سے غافل نہ تھا وہ ایسی ترکیب میں لایا ہے کہ لطف دوبالا ہو گیا ایک مطلع تو ایسا کہدیا ہے کہ ترکیب کی خوبی، طرز ادا بیساختگی میں مطلع آفتاب بن گیا ہے کہتے ہیں۔ ؎

خوش جلوہ کرد ساعدِ زیبا در آستیں

پنہاں درونِ دیدہ و پیدا در آستیں

معلوم ہوتا ہے کہ اس مطلع میں سعدیؔ اور خسروؔ کی روح کھینچ کر رکھدی ہے سبحان اللہ

سادگی میں بلندی

ایک غزل کا ایک شعر ہے:۔ ؎

من بجاں می خرم متاعِ وفا　　　لیک نایدبہ ہیچ بازارے

"میں نقد جاں دے کر "وفا" کی خریداری کو تیار ہوں لیکن افسوس ہے کہ کسی بازار میں یہ سودا بکنے کے لیئے نہیں آتا"

دوسری غزل کا ایک شعر اس سے بھی زیادہ وجد آفریں ہے:۔ ؎

از ہستیٔ خود خبر نہ دارم　　با عاشق خود حجاب تا کی

میں اپنی ہستی ہی سے بے خبر ہوں پھر ایسے عاشق سے حجاب کہاں تک" ؟

معمولی لفظوں میں کیسی نرالی بات کہی ہے؟ ہستی اور ہوش کے مقابلے میں "حجاب"
اور پردہ موزوں ہوتا ہے جب یہ چیز نہ رہی تو حجاب کی کیا ضرورت ہے۔ دوسرے
معنے یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ہستی اور ہوش بجائے خود حجاب ہیں جب یہ پردہ
اُٹھ گیا تو حجاب کے کیا معنے؟ کیسے دل نشین انداز میں بیان کیا ہے۔

طرزِ بیان اور مضمون آفرینی

ایک غزل کا ایک شعر ہے:۔

بہ آبِ زندگانی تا نہ می خواہی وضو کردن
نمازِ عشق نتواں کرد بر سجّادۂ دلہا

کہتے ہیں کہ "جب تک زندگانی کے پانی سے وضو نہ کیا جائے دل کے سجادے پر عشق
کی نماز درست نہیں ہو سکتی" "نمازِ عشق" کے لیے لفظی اہتمام کے سلسلے میں سجادۂ دل۔
آبِ زندگانی۔ وضو ملاحظہ فرمائیے پھر ان لفظوں کا پردہ اُلٹ کر معشوق حسنِ معنوی
کا جلوہ دیکھیے، شاعر کا مطلب ہے کہ جب تک کوئی شخص جان سے بے پروانہ ہوگا
اُس وقت تک اس کو عشق کا دعویٰ زیب نہیں دیتا، ہر نماز کے لیے جس طرح

خشوع اور خضوع اپنی ہستی سے بے خبری ضروری ہو اسی طرح عشق کی نماز کے لیئے جان کی طرف سے بے ہوشی لازم ہو

اس شعر میں اس قدر معنویت ہو کہ ورقوں لکھتے جایئے اور قلم کو تکان نہ ہو

محاکات و تلمیحات

حضرت فدائی کے کلام میں محاکات اور تلمیحات کا عنصر بہت غالب ہی معلوم ہوتا ہو کہ ادھر آئینۂ دل پر غبار آیا ادھر کلام میں نقش اتر آیا ادھر دل میں ٹھیس لگی ادھر کلام میں درد موجود، حقیقت یہ ہو کہ اسی ادراک لطیف کا نام شعر یا شعور کی تحریک ہی اور:- ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شاعر کے ہاتھ میں درد پیدا ہوتا ہو وہ دل میں اتر جاتا ہو پھر دل کو ساتھ لیکر صفحہ کاغذ پر لفظوں کی شکل میں کئی جگہ بکھر جاتا ہو۔

(۱)

کاش کہ بودے بہ دل و جان من

درد کہ در دست و جنا ہم بدُ

"یہ درد جس نے میرے ہاتھ کو دیا ہو کاش میری جان اور میرے دل میں ہوتا (تو مناسب اور موزوں ہوتا) اثر انداز رنگ تلمیح ہی۔

فدائی علیہ الرحمۃ کے ہاتھ میں جو درد پیدا ہو گیا تھا باوجود علاج و معالجہ عرصہ تک قایم رہا

اِس لیئے وہ دل کی چوٹ بن گیا، دل کی چوٹ، آہ بن کر نکلی جس نے شعر کی صورت اختیار کرلی قوت بیان اور تاثیر گداز دیکھیئے کہ یہ دردِ شعر میں دوسروں کے لیئے نشتر بن گیا ہے محاکات کا سب سے بڑا کمال یہی ہے۔

(۲)

ایک قطعہ میں "درد" کی تکلیف اور اس کے اثرات اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ تغزّل کا تیر اور نشتر بن جاتا ہے کہتے ہیں :- ؎

بیچارۂ مبتلائے دردے　　غم خوار کسے نہ دردمندے

گویند فدائی اے حزین است　　با نالۂ گرم و آہِ سردے

"بیچارہ ایسے حال میں مبتلائے درد ہے کہ اس کا نہ تو کوئی غم خوار ہے اور نہ دردمند، مشہور ہے کہ تیرا فدائی گرم نالہ اور آہ سرد کے ساتھ رنجیدہ ہے"

اس قطعہ میں اس حالت کا ذکر ہے کہ مصنف علیہ الرحمۃ ظفر آباد کے بنگلے میں قیام پذیر ہیں متعلقین وہاں موجود ہیں، ایک روز رات کے وقت درد میں شدّت ہو جاتی ہے، دل تڑپ جاتا ہے اور الفاظ اس حالت کا یہ دردناک نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔

اس درد اور اس کے علاوہ دوسری بیماریوں سے جو انہیں پہنچی ہیں، دل نے اُن کو جس طرح محسوس کیا ہے دل کے ٹکڑوں کو الفاظ میں اس طرح رکھ دیا ہے کہ دیکھنے والوں اور

سُننے والوں کے دلوں کو بھی چوٹ لگے، ایک جگہ اسی درد کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

بہ بحرِ درد اُفتادم بہ آں موجیکہ من دانم
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

(۳)

شاعر کا دل آئینہ ہوتا ہے وہ زمانہ کے معمولی غبار کی بھی تاب نہیں لاتا، خدانخواستہ اگر کسی ٹھوکر سے ٹوٹ جاتا ہے تو اس کا ہر ٹکڑا بجائے خود درد اور غم کا مستقل پیکر بن جاتا ہے۔

حضرت فدائی کے جوان عمر، ہونہار، خویش مولوی وکیل احمد مرحوم کا چند دنوں کی بیماری میں انتقال ہو جاتا ہے، اس کا صدمہ ان کے دل سے کبھی نہیں جاتا اشعار میں وہی صدمہ جگر کے ٹکڑے بن بن کر آتا ہے۔ ایک جگہ قطعہ تاریخ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔ ؎

چوں بجز اندوہ نبود درجہاں ازجہاں بایدمرا ہم درگزشت

ایک جگہ عجیب درد آفریں انداز میں لکھتے ہیں:۔

کارِ عجیم درچمنِ دہر در افتاد کز نخلِ مرادم ہمہ برگ وثمر افتاد

یعنی زمانے کے باغ میں میرے کام کی عجیب صورت ہوگئی کہ میرے مراد کے درخت سے سب پھل اور پتّے گر گئے۔

(۴)

ان کے ایک دوست "افضال" نام کا انتقال ہو جاتا ہی وہ تڑپ کر لکھتے ہیں:۔ ؎

الاّ بہ ماتم و غم افضال می تواں

دریا بہ ابر و ابر بدریا گریستن

دوسرے مصرعہ میں غم کا محیطِ اعظم، دریا اور ابر کی شکل میں موجزن ہی۔

(۵)

ان کے فرزند اکبر جناب ڈاکٹر سر محمد سلیمان صاحب حصول تعلیم کے لیے انگلستان جا چکے ہیں، حضرت فدائیؔ اس دوری کو محسوس کرتے ہیں لیکن اس کا اظہار کسی سے کر نہیں سکتے، یہ احساس درد بن جاتا ہی تو تڑپ جاتے ہیں مگر شعر کا پردہ چھوڑ کر:۔ ؎

با دلِ شوریدہ و با چشمِ گریاں زیستن مشکلے باشد بہ دردِ ہجر آساں زیستن

مرگِ من در ظاہر و باطن بود مرگِ نشاط من نہ پیدا زیستن خواہم نہ پنہاں زیستن

"دل شوریدہ اور چشم گریاں کے ہوتے ہوئے دردِ ہجر میں آسانی سے جینا مشکل ہی میری موت ظاہر اور باطن دونوں حالتوں میں خوشی کی موت ہی، میں نہ تو بہ ظاہر زندہ رہنا چاہتا ہوں اور نہ بہ باطن" دیکھئے ان دونوں شعروں میں اصلی جذبات کا خط و خال کس طرح پیش کیا ہی؟ اور پھر کس انداز میں رازِ دروں پر وہ بنا دیا ہی،

(۶)

یہ سمجھنا نہ چاہیئے کہ شاعر کا دل صرف "ماتم خانۂ غم" ہی بلکہ یہ آیئنہ جس طرح رنج کی سرد ہوا سے ٹھنڈا ہوجاتا ہی اسی طرح خوشی کی گرم ہوا سے گرم بھی ہوجاتا ہی، مولوی علی محمد صاحب سب جج و رئیس محمد آباد گہنہ حضرت فدآئی کی مدارات و خاطر میں کچھ اٹھا نہیں رکھتے، شاعر کا دل احسان فراموش نہیں ہوتا، فدآئی صاحب ہستی کی سب سے زیادہ قیمتی چیز حاضر کردیتے ہیں ؎

جاں فدائے علی محمد باد　　کاں محبّت بہ استواری کرد

"میری جان علی محمد پر فدا ہو کہ اُنھوں نے محبّت کو مضبوط کردیا"

(۷)

دنیا کے معاملات اور اس کے ہر جزو پر شاعر کی نگاہ پہنچتی ہی، معمولی واقعہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہی غیر معمولی واقعات کی تاب نہیں لاتا، بازار عالم میں سودائے وفا ہمیشہ گراں رہا ہی اب گراں تر ہوگیا ہی، حضرت فدآئی اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔ ؎

امتحان وفا نمودم چند

دوستاں را من آزمودم چند　الخ

(۸)

اپنے شب و روز کے آلام کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔ ؎

شکر فدائی کہ روزِ ازل　　　درد و الم شام و صباحم بداد

"ای فدائی خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے صبح و شام (رات دن) درد و الم دے دیا ہے"

رنج کی جب انتہا ہو جاتی ہے تو انسان شکوے کی جگہ شکر کرنے لگتا ہے، یہ صورت بھی کہ بلند حوصلہ، عالی ظرف شکوے کی جگہ شکر کرتا ہے، مذہب کی یہی تعلیم ہے۔

حضرت فدائی نے اسی خیال اور مسئلے کو بیان کیا ہے آیئے اس مسئلے کو دوسری طرح بھی سمجھ لیں لیلےٰ نے جب مجنوں کا کاسۂ گدائی اس سے لیکر زمین پر پٹک دیا تو مجنوں پر وجد طاری ہو گیا، دوسرے فقیروں نے پوچھا کہ "اس سرور کا کیا سبب ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "محبوب کی نظر امتیاز کی ذرّہ نوازی" انسان بہت مشکلوں سے اس مقام پر پہونچتا ہے حضرت فدائی اسی مقام کی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔

رندی و مستی

حضرت فدائی صف ماتم پر بیٹھ کر مئے مسرت و شادانی کی جرعہ کشی کی بھی تعلیم دیتے ہیں، خود مست ہوتے ہیں دوسروں کو مست بنانا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

(۱)

رندی و مستی بہ دماغم فزود　　　ساغرِ می بہرِ فلاحم بداد

"اس نے میرے دماغ میں رندی اور مستی بڑھا دی، میری فلاح کے لیے ساغر می دیدیا"

اور شعرا کی طرح یہ نہیں کہا کہ رندی اور مستی میرے دماغ پر طاری کر دی اس لیے نتیجتاً مخبوط اور مجنون بنا دیا بلکہ یہ کہا ہو کہ رندی اور مستی کو میری قوّت دماغ بنا کر اس قوّت کو بڑھا دیا ہو کیسا نادر مضمون اور انوکھا طریقہ بیان ہو ؟

(۲)

شاہد و ساقی و مطرب ہمہ مطلوب من ہست

کیش من پیروی پیر مغانے دارد

کہتے ہیں کہ مستی اور رندی کا مذہب شارع رندی و مستی (پیر مغاں) کی پیروی ہو اور بس۔

(۳)

مستی و رندی کی اس طرح تعلیم دیتے ہیں :- ؎

صبحدم مے خور و محوِ رخِ جاناں برخیز

مست و لایعقل و خود رفتہ و نالاں برخیز

(۴)

فرماتے ہیں کہ مستی اور رندی کی "آمد" کے مقابلے میں "زہد" کی آورد، مکر و فریب، تکلف و تصنع ہی۔ ؎

جبہ و دستار باشد بہر زر

رشتۂ تسبیح زاں مکّارہ تر

مطلب یہ ہی کہ ظاہری زیب و زینت تسبیح کی گردش وغیرہ حصولِ دُنیا کے لیئے جال ہی

تعلیم اخلاق

شاعر، صرف خم شراب میں گرا کر دور سے تماشا دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ وہ اخلاق کی تعلیم سے روح کو آراستہ بھی کرنا چاہتا ہی. چنانچہ حضرت فدائی اس رنگ میں اس طرح جلوہ گر ہیں:۔

(۱)

صفتِ دیدۂ نرگس بہ تماشائے جہاں
چشم بکشا و نگاہے کن و حیراں برخیز

"نرگس کی طرح آنکھیں کھول کر دُنیا کا تماشا دیکھو، اور مناظر عبرت سے حیراں ہو جاؤ" کیونکہ انسانی بصیرت کا یہی تقاضا ہی۔

(۲)

مصیبت در پسِ ہر راحتے ہست
کجا باشد گلے از خار فارغ

ہر راحت کے پیچھے مصیبت لگی ہوئی ہی، جیسے ہر پھول کے ساتھ کانٹا ہوتا ہی، انسان کو راحت میں گم ہونا نہ چاہیئے۔

(۳)

ندارم صورتے جز دوست در دل منم از منت اغیار فارغ

اپنے دل میں دوست کے علاوہ کچھ نہیں رکھتا، مجھے غیروں کے احسان کی پروا نہیں"
وفاداری اور توحید کے یہی معنی ہیں۔

(۴)

دل قاروں بہ حسرت می برد رنج

مالدار بخیل کے پاس حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں ہوتا، توکّل اور استغنا کی تعلیم ہے۔ ان عناصر شعر کے علاوہ کلام فدائی میں زور تخیل، تشبیہ و استعارے کی فراوانی، اور تمام ضروریات بہ کثرت موجود ہیں۔

موازنہ

کلام فدائی کی خصوصیات کا بیان نا تمام رہ جائے گا اگر ان کے کلام کا موازنہ ان کے پیشرو شعرا سے نہ کیا جائے گا۔

موازنہ کرنے سے پہلے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ حضرت فدائی نے کس خصوصیت کو نقطۂ نظر بنایا ہے؟

یہ پہلے بتایا گیا ہے کہ فدائی، فارسی میں حافظ۔ جامی۔ حزیں کے کلام کو پسند کرتے تھے اور حتی الوسع انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی ان کی کوشش بھی تھی۔

حافظ، اہل منتج اور خمریات میں اپنا جواب نہیں رکھتے، جامی نے اپنی غزلوں میں

تصوّف کے مقامات طے کیے ہیں، حزیں سراپا سوز و گداز ہیں، فدائی نے ان تینوں کے کلام کا عطر مجموعہ طیار کر کے اپنے کلام کو مشک افشاں اور روح نواز بنایا ہے۔

ان کا دیوان یا مجموعہ تضمین غزل حافظ سے شروع ہوتا ہے، حافظ کے رنگ میں کہاں تک ڈوبے ہیں ہمارے علاوہ مبصر نگاہیں بھی بتا سکتی ہیں۔

دوسری غزل حافظ کی غزل پر ہے اور اس جام میں بھی حافظ شیراز کی مے دو آتشہ چھلک رہی ہے تیسرے نمبر میں بھی حافظ کی غزل پر تضمین ہے، اس میں بھی وہی رنگ، وہی کیف وہی بیخودی، وہی مستی ہے۔

چوتھی تضمین مولوی محمد مصطفےٰ آثم ولیدپوری کے رنگ کا چربہ یا نقش ثانی ہے، آثم مرحوم مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے ارشد تلامذہ میں تھے اور فارسی کے خوش گو شعرا میں شمار کیے جاتے تھے، فارسی کے ساتھ عربی کے مناسب ٹکڑے تغزل کی شان سمجھی جاتی تھی، حضرت فدائی نے وہ شان بھی بانکپن سے قایم رکھی ہے، اگر یہ نہ بتایا جائے کہ آخر کا شعر آثم کا ہے تو فدائی اور آثم میں فرق محسوس کرنا دشوار ہے، نقاش کا سب سے بڑا کمال یہی ہے فدائی کی بیشتر غزلیں حافظ کے رنگ میں ہیں، اس سے کم جامی کے رنگ میں، اس سے کم حزیں کے رنگ میں۔ حزیں کے رنگ میں ایک غزل دیکھ لیجیے تو فدائی کی قدرت سمجھ میں آجائے گی، یہ غزل حزیں کی ردیف اور قافیے میں بھی ہے

اس جگہ ہم دونوں غزلیں درج کر دیتے ہیں تاکہ موازنے میں آسانی ہو۔

حزیں

۱۔ زہرِ غمِ ہجرِ تو بجاں کارگر افتاد
امیدِ وصالِ تو بہ عمرِ دگر افتاد

۲۔ در قلزمِ دل نیست ہمانا نمِ خونے
کز دیدہ بدامن ہمہ لختِ جگر افتاد

۳۔ ای آنکہ کنی آتشِ دل تند بدامن
خوش باش کہ در خرمنِ جانم شرر افتاد

۴۔ عشقِ تو زند راہِ خرابانی و زاہد
ایں شعلہ چہ شوخ است کہ در خشک و تر افتاد

۵۔ در دامنِ شب طرۂ پیوستہ گشودے
بوے بدملغ آمد و شورے بسر افتاد

۶۔ ماندیم دل تنگ نہ آزاد نہ بسمل
ہر صید کہ در دامِ تو بیداد گر افتاد

۷۔ ایں آں غزلِ نغمہ سرایانِ عراقست

فدائی

۱۔ از دست بشد دل چو نگاہم بہ بر افتاد
چوں زلف بیادم ہمہ غمہا بسر افتاد

۲۔ کارِ عجبم در چمنِ دہر در افتاد
کز نخلِ مرادم ہمہ برگ و ثمر افتاد

۳۔ منت کشِ عشقم کہ بیک نیم نگاہی
صد ناوکِ دلدوز بہ جانِ جگر افتاد

۴۔ چوں مرغکِ زیرک سخنِ مہر بسنجید
صیاد دگر دید و بدام اثر افتاد

۵۔ چوں ماہِ من از چہرۂ خود پردہ برافگند
از روے نظر جلوۂ شمس و قمر افتاد

۶۔ مجنوں سبقِ دشت نوردی ز من آموخت
از جوشِ مئے عشق بہ جامِ دگر افتاد

۷۔ ای بے خبر از حالِ فدائی کہ ندانی

فدائی	حزیں
شب چو ل بہ سگ کوے تو اور الگذرافتاد	کز کلاکِ حزیں تو چو نگیں گہر افتاد

حزیں کی غزل معنوی اعتبار سے گداز کا مرقع ہی، فدائی نے اس رنگ کو اس طرح اڑایا ہی
کہ ایجادا کی مستقل صورت ہو گئی ہی۔

حزیں نے وطن سے دور رہنے کی وجہ سے اپنی غزلوں کو اکثر وطن کا مرثیہ بنایا ہی،
وطن کی ایک ایک چیز حسرت سے یاد کرتے ہیں اور اپنی غربت پر سینہ کوبی کرتے ہیں
وطن کے احباب اور اعزّا کی بے مروّتی پر سر دُھنتے ہیں۔

فدائی ابنائے وطن کے سلوک سے اس قدر متاثر معلوم ہوتے ہیں کہ ان کا دل جذبات
کا پھوڑا ہو گیا ہی ظاہر ہی کہ اس قسم کا توارد ارنگ اور بیان کے توافق کا بہت کچھ موید ہی ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

غزل ایک قسم کی آہ ہوتی ہی، جو چوٹ کھائے ہوئے دل سے بے ساختہ نکلتی ہی، البتہ
فرق ہوتا ہی طور اور طریقے کا۔

اس جگہ دونوں شاعر اپنے اپنے انداز میں ایک ہی قسم کے زخم سے بسمل دلوں کو دیکھنے والوں کے

سامنے رکھدیتے ہیں۔

فدائی کا یہ کمال دیکھیے کہ جب حزیں کے رنگ میں کہتے ہیں تو حزیں کی خصوصیات طرز ادا، ترکیب، نشست الفاظ، معنوی بلندی، بیساختگی سب کچھ لے لیتے ہیں۔

اچھا آئیے اب اسی "مثالِ حزیں" شاعر کو "جامی" کے جامے میں دیکھ لیجیے۔

غزل جامی

چہ گویم کز غمت چوں می تپد دل
چو صیدے غرقہ در خوں می تپد دل

ز روئے لطف دستے بر دلم نہ
ببیں کز دستِ تو چوں می تپد دل

چو مرغ اُفتادہ اندر دام صیاد
مرا در زلف افزوں می تپد دل

چو آں ماہی کہ بیروں افتد از آب
ز بزم وصل بیروں می تپد دل

نخستیں جنبشِ آمد جنبشِ عشق
حریفاں را اکنوں می تپد دل

غزل فدائی

بہ لیلیٰ گفت مجنوں می تپد دل
بگفتا بے منت چوں می تپد دل

بہ شوق بادہ در خوں می تپد دل
ز حد وسع بیروں می تپد دل

ندانم آتش ہجرت چہا کرد
دروں سوزد کہ بیروں می تپد دل

بہ وردِ عشق چوں ہم رنگ بودن
پئے فرہاد و مجنوں می تپد دل

بقیدِ تنگنائے ضبط تا کے
برائے کوہ و ہاموں می تپد دل

پئے تسکینِ جامی بوئے بخشش
کہ امروزش دگرگوں می تپد دل

بدامِ کاکلِ پیچاں فتد جاں
بتابِ زلفِ شبگوں می تپد دل

حدیثِ عشق تا تکرار کردند
بہ الفاظ و بہ مضموں می تپد دل

رباید عقل کے زہرِ غمش را
ز تریاقِ فلاطوں می تپد دل

کلامِ خوب و رنگیں جاں فزاید
بہ شعرِ نغز و موزوں می تپد دل

چو مرغِ قبلہ رو دارم بہ کوشش
مرا در سینہ افزوں می تپد دل

شنیدستم کہ مستی غم رباید
من آں مستم کہ افزوں می تپد دل

لئیم و بوالہوس دیدم کہ اورا
بہ جمعِ گنجِ قاروں می تپد دل

ترا دیدم فدائی با ہمہ درد

بہ بذلِ جانِ محزوں می تپد دل

حضرت جامی پہلے شعر میں فرماتے ہیں کہ "میں کیا کہوں، کہ تیرے غم کی وجہ سے دل کیونکر تڑپتا ہے، (بس سمجھ لے کہ) خون میں لتھڑے ہوئے شکار کی طرح تڑپتا ہے۔

اس میں کیا شبہ ہے کہ حضرت جامی کا مطلع اپنے انداز میں جواب نہیں رکھتا، تڑپنے کی تصویر ایسی مثال سے کھینچی ہے کہ اس سے بہتر سمجھ میں آنا مشکل ہے۔

حضرت فدائی نے نیا اسلوب سامنے رکھا ہے، کہتے ہیں "مجنوں نے لیلیٰ سے کہا کہ میرا دل تڑپ رہا ہے لیلیٰ نے جواب دیا کہ میں تیرے یا تیرے دل کی تڑپ جب دیکھتی ہوں تو میرا دل (بھی) تڑپ اٹھتا ہے۔"

سبحان اللہ! عاشق کے عشق کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ معشوق کو متاثر کرلے، مجنوں کی عمر بھر کی صحرا نشینی اور صحرا نوردی، سگ لیلیٰ کی پابوسی، اس کی گلیوں کا طواف، فرہاد کی کوہ کنی، جوئے شیر لانے کی کوشش معشوق کے دل میں گھر کرنے کیلئے تھی، یہ تو عشق مجازی کا رنگ ہے عشق حقیقی کا رنگ اس سے بھی زیادہ چوکھا ہے حضرت امیر خسرو اپنے پیر کو قبلۂ عشق مان کر ان کا طواف کرتے ہیں، حضرت جنید و شبلی، سرمد و منصور جو کچھ کرتے ہیں اسی راہ اور منزل کی طلب میں لیکن نتیجہ وہ ہوتا ہے جو سب کو معلوم ہے۔

فدائی نے اس منزل کو عاشق کے دل کی تڑپ سے دم بھر میں طے کرا دیا، اس "تپش دل"
کی کیفیت اور تاثیر بے حد کی وہ حد ل جاتی ہے جو پائے طلب سے اکثر دور رہا کی ہے۔
حضرت جامی چونکہ جامِ عشقِ حقیقی کے سرشار تھے اس لیے ان کے سامنے ایسی ہی "مے"
پیش کی ہے، جس کو پیتے ہی انسان عرفان کی آخری منزل پر پہونچ جاتا ہے۔
حضرت جامی دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ "از راہ لطف میرے دل پر ہاتھ
رکھ کر دیکھ تو لو کہ یہ دل اب کیونکر تڑپتا ہے"؟
حضرت فدائی فرماتے ہیں کہ "شراب (ارغوانی) کے شوق میں دل، خون میں تڑپ رہا
ہے اس کا خون میں تڑپنا ایسا ہے کہ اپنی وسعت اور اپنی بساط سے باہر کام کر رہا ہے"
اس شعر میں "حد وسع" کی ترکیب اور بلاغت کی تعریف نہیں ہو سکتی۔
اس طرح غزل کے تمام اشعار میں "فدائی" نے اسی قسم کا کمال اور زورِ بیان دکھایا
ہے۔ "بیروں" کا ایک اور قافیہ دونوں جگہ اس طرح ہے۔

جامی	فدائی
چو آں ماہی کہ بیروں افتد از آب	ندانم آتش ہجرت چہا کرد
ز بزم وصل بیروں می تپد دل	دروں سوزد کہ بیروں می تپد دل

حضرت جامی فرماتے ہیں کہ جس طرح مچھلی، پانی سے باہر نکل کر تڑپتی ہے، اسی طرح بزم وصل سے

یا ہر دل تڑپ رہا ہے۔"

حضرت فدائی کہتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا کہ تمھاری ہجر کی آگ نے کیا کیا؟ دل

اندر جل رہا ہے یا باہر تڑپ رہا ہے۔"

دونوں شعروں میں وہی قافیہ مشترک ہے لیکن اندازِ بیان نے ایک دوسرے

کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ حضرت فدائی نے بیانِ شک سے شعر کو معنوی حیثیت سے بہت

بلیغ کر دیا ہے، اگرچہ اُس طرف حضرت جامی کا انداز بے مثال ہے۔

حضرت "فدائی" جو دوسری جگہ "حزیں" کے رنگ میں جلوہ گر تھے، جامی کے لباس

میں بہ آں خوبی و رعنائی جامی بن گئے ہیں۔

یہ چیز ایسی ہے کہ کوشش سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عطیہ الٰہی کی نوازش ہے۔

فدائی کے مجموعہ کلام فارسی کی یہ خصوصیت یاد رکھیئے کہ اس کے تمام اصناف میں اگر

تقلید ہے تو رشک ایجاد بن گئی ہے اور اگر ایجاد ہے تو اس کا جواب مشکل سے مل سکتا ہے۔

اب اس کے بعد حضرت فدائی کے اُردو کلام پر تبصرے کی باری ہے۔

* * *

ادبیاتِ اُردُو

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ فارسی گوئی میں کمال رکھنے والے اُردو کی زمین میں پھلتے پھولتے نہیں، اسی طرح باغ اُردو کے سرسبز و بارآور گلشن فارسی میں آکر مرجھا جاتے ہیں، ایسی ہستیاں کم ہیں جو دونوں اقلیموں کی ایک ساتھ فاتح ہوں۔

حضرت فدائی حقیقتاً فارسی کے شاعر ہیں، لیکن اُردو میں بھی ان کا رنگ امتیاز کے ساتھ علحدہ ہے وہ مومن کے تغزل اور حضرت آسی کے تصوف، داغ کی زبان، درد کی چٹکیوں سے اپنی غزل کا گلدستہ تیار کرنا چاہتے ہیں، حیرت بر حیرت یہ ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اُردو میں غزلوں کی تعداد اور اصناف بالخصوص نظموں کے مقابلے میں بہت کم ہے، فارسی میں تو کسی سے تلمذ نہ تھا، بعض اقوال یہ ہیں کہ مولانا نجم الدین چریاکوٹی سے مشورہ سخن کیا تھا لیکن اس روایت کی کوئی سند نہیں، البتہ یہ صحیح ہے کہ مولانائے موصوف کے ساتھ مجالست کا فیض ضرور پہونچا تھا، اُردو میں تبرکاً حضرت آسی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوکر ان کے کمال کے معتقد بن گئے،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت آسی علیہ الرحمۃ اپنے وقت کے سجّادہ شاعری کے

شیخ اعظم تھے تصوّف کی شاعری میں ان کا جو رنگ ہے ان سے پہلے اور ان کے بعد کوئی ان کا مثل نظر نہیں آتا۔ ملاحظہ فرمائیے حضرت فدائی، خواجہ میر درد کے رنگ میں جلوہ نما ہیں

(۱)

۱۔ جینا آزار ہوگیا ہے ۔۔۔ مرنا دشوار ہوگیا ہے

۲۔ جو داغ وفا تھا دل میں روشن ۔۔۔ وہ شمع مزار ہوگیا ہے

۳۔ سرمایۂ نشۂ جوانی ۔۔۔ پیری میں خمار ہوگیا ہے

۴۔ کچھ ٹھیک نہیں دل و جگر کا ۔۔۔ جب سے غم یار ہوگیا ہے

بقول جناب آزاد "صاحب آب حیات" درد چھوٹی بحروں میں نشتر چبھوتے ہیں، فدائی نے بھی نشترستان آراستہ کیا ہے۔

چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ داغ کی زبان کا آئینہ ہے، ساتھ ہی ساتھ محاورے کی طلسم بندی سے بھی نہیں چوکے ہیں۔

(۲)

اسی رنگ میں دوسری غزل ملاحظہ فرمائیے۔

جوانی گئی زندگانی گئی ۔۔۔ وہ قصّہ چکا، وہ کہانی گئی

مجھی تک تھا سب شکوۂ زندگی ۔۔۔ نہیں ہیں تو سب بدگمانی گئی

پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "قصّہ چکا" کیسا دل نشین محاورہ ہے، روانی کی یہ شان ہے کہ دریا

موجوں کے ساتھ رواں ہے۔

حضرت آسیؒ کے رنگ میں دیکھیے:۔

(۱)

۱۔ اس اپنی فقیری میں نہ کچھ مال نہ زر ہے تھا اک دلِ آگاہ، وہ اللہ کا گھر ہے

۲۔ ہم سمجھے ہیں کچھ نفیٔ حقائق کے طلسمات معشوق وہ ہے جس کے دہن ہے نہ کمر ہے

پہلے مصرعہ میں "سامانِ دُنیا" کی نفی کی ہے، دوسرے میں دل کی یا خود اپنی نفی کی ہے پھر اس سے دعویٰ افلاس اس طرح ثابت کیا ہے کہ کسی کو یارائے دم زدن نہیں، دوسرے مصرعے میں یہ نکتہ بھی دیکھ لیجیے، کہ دل اپنا نہیں ہے بلکہ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، گویا اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ "مومن کا دل خدائے رحمٰن کی اُنگلیوں کے درمیان ہوتا ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اس کو پلٹ دیتا ہے"

اس مضمون کو اس انداز اور اس طرز میں کہا ہے کہ مصرعہ سراپائے کیف بن گیا۔ یہ اندازِ بیان بالکل حضرت آسی کا ہے "دل آگاہ" کی ترکیب بھی انھیں کی ہے مثلاً ایک جگہ حضرت آسی فرماتے ہیں۔

حرص دولت کی نہ عزوجاہ کی

ایک حسرت ہے "دلِ آگاہ" کی

دوسرے شعر کے پہلے مصرعے کی ترکیب حضرت آسی کی ہے، طرزِ بیان بالکل ایسا ہے کہ

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فدائی کے نام سے جناب آسی درفشاں ہیں۔

(۲)

یہ غزل بھی حضرت آسی رحمۃ اللہ علیہ کا عکس ہے۔

ٹوٹا نہیں تارِ زندگانی — اللہ رے زورِ ناتوانی

میرے لیے وعدۂ نظارہ — موسیٰ سے خطابِ لن ترانی

حضرت فدائی نے اکثر غزلیں حضرت آسی ہی کے رنگ میں لکھی ہیں۔ البتہ کلام دوسرے شعرا کا تتبع بھی کیا ہے چنانچہ آپ نے مومن کے طرز کا نمونہ دیکھ لیا ہے اب مومن کے انداز میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)

۱۔ بوالہوس عرض کے جو کہتے ہیں ستم کرتے ہیں — سچے عاشق پہ تو معشوق کرم کرتے ہیں

۲۔ آہ ناکامیِ دل ہائے ہجومِ اندوہ — کیا کہیں کس طرح بسر شبِ غم کرتے ہیں

۳۔ ایک وہ ہیں کہ ستم توڑ رہے ہیں ہم پر — ایک ہم ہیں کہ سمجھتے ہیں کرم کرتے ہیں

جو لوگ مومن کی جادونگاری پیشِ نظر رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ فدائی نے خانۂ غزل میں مومن کے آئینے لگا دیے ہیں۔

(۲)

ذیل کی غزل میں "مومن" پردہ التباس اٹھا کر صاف صاف بول رہے ہیں۔

۱۔ نگاہِ ناز سے تیری بچا کیا — قدر کہتے ہیں کس کو اور قضا کیا

۲- ہماری بے دلی، تیرا تغافل　　　جفا کیا چیز اُمیدِ وفا کیا

اچھا اب داغؔ کی سلاست اور زبان کا مزا بھی لے لیجیے۔

(۱)

۱- حرفِ مطلب سوال سے چھوٹا　　　مُدّعا، عرضِ حال سے چھوٹا

۲- خوش ہوں دیوانہ بن کے اے واعظ　　　تیری بحث و جدال سے چھوٹا

اسی رنگ میں دوسری غزل کے بھی دو شعر ملاحظہ فرمائیے:-

۱- دل درد پسند ہو گیا ہے　　　وقفِ غمِ چند ہو گیا ہے

۲- جاں دیتے ہیں بوسہ لیکن　　　دل ان کو پسند ہو گیا ہے

ان مثالوں کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ کہنا آسان ہو گیا ہے کہ ایک فدائیؔ اپنی ہمہ گیری سے آسیؔ بھی ہیں اور مومنؔ بھی، دردؔ بھی ہیں اور داغؔ بھی، یہ اتنا بڑا کمال ہے کہ اس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ حضرت آسیؔ کی مشہور غزل ہے:-

کچھ کہوں میرا جو کہنا کیجیے　　　چاہنے والے کو چاہا کیجیے

اس پر تضمین لکھی ہے، اس میں بھی حضرت آسیؔ ہی کا رنگ ہے، تصوّف کے مقامات، ترکیب کی چستی، بندش کی بے ساختگی، لطفِ زبان، سلاست، چند الفاظ میں بڑے سے بڑا مضمون کھپا نا، آسیؔ کی جتنی خصوصیتیں ہیں فدائیؔ کی تضمین میں موجود ہیں۔

ایک نکتہ قابلِ بیان ہے، عام طور پر تضمین کا نہ تو کوئی وزن ہوتا ہے اور نہ اصناف سخن میں اس کا کوئی درجہ ہے لیکن فدائی نے جہاں کہیں تضمین کی طرف توجہ کی ہے اس کو بلند اور نہایت وقیع کر دیا ہے

آسی کی مشہور غزل "چاہنے والوں کو چاہا کیجیے"، پر فدائی نے جس قابلیت سے تضمین کی ہے بلا مبالغہ اس کی مثال دنیائے تضمین میں نہیں ملتی۔

تضمین کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام اشعار اور خیالات مقدمہ کی صورت میں مسلسل ہوں تاکہ نتیجہ اس کے مطابق ہو۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ جس شاعر کے شعر یا مصرعے کی تضمین ہوتی ہے وہی نتیجہ ہوتا ہے اور دوسرے اشعار مقدمات ہوتے ہیں، اس کا توازن بہت مشکل ہے، جس میں یہ توازن جس قدر بہتر ہوتا ہے اسی قدر تضمین کامیاب کہی جا سکتی ہے، اس نقطۂ نظر سے فدائی کی تضمین کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے

سجدہ کرتے ہیں حقیقت دیکھ کر　　حق کا جلوہ، حق کی قدرت دیکھ کر

ہو گیا میں محو حیرت دیکھ کر　　کس کو دیکھا اس کی صورت دیکھ کر

جی میں آتا ہے کہ سجدہ کیجیے

"جی میں آتا ہے کہ سجدہ کیجیے" کے ٹکڑے کو ہر مصرعے میں چسپاں کیجیے اور دیکھیے کہ یہ ٹکڑا کیا کر رہا ہے اور آپ کا دل اس ساز ہوش ربا پر کیا کہتا ہے؟

ہم نے اس غزل پر اکثر شعرا کی طبع آزمائیوں کا نمونہ دیکھا ہی لیکن ہم اس تضمین کے متعلق بیباکانہ کہہ سکتے ہیں کہ "تو چیزے دیگری"

متفرقات میں ایک شعر کی لطافت اور پاکیزگی دیکھئے:۔

قاضی کو احتساب کی ساقی مجال تھی ۔۔۔ پی ہم نے وہ شراب جو پہلے حلال تھی

نظموں میں گزارش کے عنوان سے جو نظم (غزل نما) لکھی ہی، اس کی تحلیل کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ کثیر المعانی ورقوں کے مضمون کی روح کھینچکر چند شعروں میں رکھدی ہی شنوی میں "ساقی نامہ" کے اشعار دریا کے لہروں کی طرح رواں ہیں، زبان کی خوبی اور ادا کی برجستگی میں "مومن" کی مثنویوں کا مو بہ مو خاکہ ہی۔

"رباعیوں" میں "درد" کی چٹکیاں، خیام کی طرح اخلاق کی شہد آمیز تلخیاں محرک قبول طبائع ہیں مثلاً لکھتے ہیں:۔

فکر دولت نہیں کرینگے کبھی ۔۔۔ ذکر الفت نہیں کرینگے کبھی

دوستوں کو بھی آزما دیکھا ۔۔۔ اب محبت نہیں کریں گے کبھی

اگرچہ عام طور پر یہ ذوق رباعیوں میں رائج نہیں اساتذہ نے اس کو جائز کیا ہی۔ کہا جاتا ہی کہ "شاعر" کا ادراک مستقبل کو بھی دیکھ لیتا ہی، حضرت فدائی نے اپنی بیماری ناقابل علاج کی حقیقت سمجھ کر، اپنی وفات کا قطعہ تاریخ لکھ دیا تھا

عشق میں کچھ نام اپنا کر لیا — داغ حسرت کا دلوں پر دھر گیا

سال لکھیے از سرِ آہِ حزیں — دوست کہتے ہیں "فدؔائی مر گیا"

اس میں ۱۳۳۶ھ نکلتا ہی، اس سال نہیں دوسرے سال انتقال ہوا اس لیے از سرِ آہِ حزیں کی جگہ از سرِ باغِ بہشت سے ۱۳۳۷ھ نکال کر یہ قطعہ لوحِ مزار پر کندہ کیا گیا۔ حضرت فدائی آج دُنیا میں نہیں ان کے کارنامے معلوم نہیں صفحۂ ہستی پر کب تک نقش و نگار بنے رہیں گے؛

میرے بزرگ محسن! جس طرح آپ نے اپنی زندگی میں اکثر میری عزت افزائی کی تھی اسی طرح حجاب باطنی سے جہاں انسانی نظریں اور انسانی عقل پہونچ نہیں سکتی آپ کے روحانی تصرّفات نے مجھ پر یہ کرم کیا ہی کہ مجھ ناچیز اور ہیچمیرز سے اپنی سوانح کی ترتیب کی خدمت لیکر ان نقوش پریشاں کو معلوم نہیں کب تک باقی رکھنے کا سامان کر دیا ہی اللہ تعالیٰ قیامت تک آپ کی روح پر رحمت کاملہ اور مرضیات مخصوصہ کی بارش کرتا رہے۔ آمین

کیفی چریاکوٹی

ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ۔ الہ آباد

۱۶ راپریل ۱۹۳۴ء

حصّہ اوّل

فارسی

۷۸۶

تضمین بر غزل حضرت لسان الغیب خواجہ شمس الملت والدین

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ

الا یا ایہا المطرب بکن سازے انا ملہا — دف و چنگ و رباب آری کہ برباید غم از دلہا
الا پیرِ مغاں مے دہ بہ بدمستاں محفلہا — الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

الا اے عشق غوغائے تو در ہر بزم و محفلہا — الا اے حسن وسودایت لگہا وعنادلہا
الا پیرِ مغاں لے چارۂ درد و غم دلہا — الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

بہ حسن دل فریبی در جہاں صد جلوہ فرماید — طلسم بوالعجب در کاروبارِ عشق بنماید
ز نسماتش جہاں احالِ روح و رواں آید — بہ بوئے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید
ز تابِ جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

بہ دریائے تعشق دست و پائے می زنم باطل — چناں باد مخالف نے کہ سیم کرد لاحاصل

شکستہ بادبان و تند باد و ناخدا غافل
شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل
کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحلہا

مترس از بیم فتوائے کہ مفتی زماں گوید
مترس از زہد و تقوائیکہ واعظ رائیگاں گوید
مرا پیرِ طریقت رازدارِ دو جہاں گوید
بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

زمانہ در پئے آزارِ من اندر کمیں ہستم
بہ مہرِ یار دل بندم، بہ جورِ یار خرسندم
اگر قربِ وصالِ یار حاصل ہم شود رنجم
مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

مرا در عیشِ مستی بر درِ میخانہ دید آخر
بگوشِ خویش ہائے و ہوی مستانہ شنید آخر
بہ بزمِ غیر، نامِ من بہ رسوائی رسید آخر
ہمہ کارم ز خودکامی بہ بدنامی کشید آخر
نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

فدائی تو مستانہ سخن گوید شنو حافظ
نیرزد لذتِ دنیا بہ قدرِ نیم جو حافظ
مے و معشوق مگذار و رہ تقوی مرو حافظ
حضوری گر ہمی خواہی ازو غائب مشو حافظ
متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا

غزل

پئے تعظیم خنجر ہا پئے توقیر بسملہا — رمیدن آید از جانہا تپیدن آید از دلہا

نہ جوش عشق مجنونے نہ شور حسن لیلائے — مروّت ریزد از جانہا محبّت خیزد از دلہا

شراب و ساقی و شاہد پرستی مذہب عشقم — کجا دانند رہ گم کردگاں تدبیر منزلہا

بہ حد ذوق خود راہش بہ گیتی ہر کسے پوید — ز مجنوں جوش صحراہا ز لیلےٰ ناز محملہا

محو معشوق و بدمستی و رندی اہل عرفانے — نہ زہد و طاعت و طامات و وجد حال محفلہا

میان مشکل و آساں ندارد عشق تمیزے — نمی پرسم ز آسانہا، نمی ترسم ز مشکلہا

بآب زندگانی تا نمی خواہی وضو کردن — نماز عشق نتواں کرد بر سجّادہ دلہا

من از صائب نمی خواہم نہ از ناصر علی چیزے
فدائی را نمی زیبد چنیں تحصیل حاصلہا

غزل



کجا سیرِ مونگیر و لطفِ راہ و قطعِ منزل‌ها — کجا درماندگانِ لکھنؤ و پاے در گِل‌ها

دوا نا سازگار آمد بہ ناسازیِ بختِ من — "کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکل‌ها"

بہ بحرِ درد افتادم بآں موجیکہ من دانم — "کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل‌ها"

نمی سازم بہ تدبیر و عمل در جوشِ ناکامی — "کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزل‌ها"

نہ تابِ دیدمی دارم نہ ضبطِ ہجر می بینم

بہ بختِ من فدائی عقدہا بست است مشکل‌ها

تضمین بر اشعار حضرت حافظ شیرازیؒ

چوں نمی پرسی منِ بدنام را خستہ و غم دیدہ و ناکام را
بیں منِ بدمست و مے آشام را ساقیا برخیز در دہ جام را
خاک بر سر کن غمِ ایّام را

من مے و معشوق خواہم ہر زماں عشق ورزم در عیان و در نہاں
بیخود و دیوانہ بودن در جہاں گرچہ بدنامی است نزدِ عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

جبّہ و دستار باشد بہرِ زر رشتۂ تسبیح زاں مکّارہ تر
زہد و تقوے اے فدائیؔ پُرخطر ساغرِ مے در کفم نہ تا ز سر
بر کشم ایں دلق ازرق فام را



تضمین
بر شعر
مولوی مصطفٰے مرحوم

سہامُ حبک اذا بجرحٍ اتےٰ الینا فزاد شوقا
تو در حجاب و من از تمنّا، بدل نہ دارم سرِ شکیبا
مئے محبّت، بجام امّا، نہ در گلویم رسیدہ صہبا
شنیدہ وصفِ جمالِ زیبا، نہ دیدہ محمل نہ دیدہ لیلا
شغفتُ حبا مرضتُ شوقاً وزدتُ لہفا من الغراما



مادۂ تاریخ

وفات مولوی وکیل احمد صدیقی مرحوم

چوں وکیل احمد ز دنیا رخت بست — صبر از دل ہمچو تیر از شست رفت

چوں بجز اندوہ نہ بود در جہاں — از جہاں باید مرا ہم در گزشت

از بہر دل در دل آمد سال غم

چوں وکیل احمد ز دُنیا بست رخت

---

۴ + ۱۴ =۱۹ ۱۸ ۱۹

۱۹۱۸ء

قطعہ

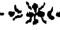
کمالِ تو جمالِ عالمے ہست　　جمالِ تو کمالِ عالمے ہست
بہ جاے خود نظیرِ خویش باشی　　مثالِ تو محالِ عالمے ہست

غزل

تیغِ جفاے یارِ ستمگار نازک ست　　از جانِ من کہ نازکِ بسیار نازک است
عہدِ وفاے یار کہ بسیار نازک است　　لیکن دلِ من ست کہ از یار نازک است
گیرم کہ بستہ است ولے پرسم از لبش　　اقرار نازک است کہ انکار نازک است
زہد ریا فوا زومی و مطرب ہم بیار　　با شیخ گو کہ جبہ و دستار نازک است
مطربؔ از چنگ غزل خوش بخواں ولے　　آہستہ زخمہ زن کہ رگِ تار نازک است
دانم کہ وقتِ نزع نگاہم جفا کند　　یارب نگاہ دار کہ آں یار نازک است
ہشیار نیست کس کہ مرا و بیخودِ تو نیست　　فرقے میانِ بیخود و ہشیار نازک است
یارب نگاہ دار ز آفاتِ روزگار　　با ساقیؔ کہ رشتۂ مے خوار نازک است

افسانۂ فدائیؔ غم دیدہ مگو
دانم کہ طبعِ مونسِ غمخوار نازک است

غزل



پیرِ مغاں، نیاب صلا حم بداد — دخترِ رز را بہ نکا حم بداد

رندی و مستی بہ دماغم فزود — ساغرِ مے بہرِ فلاحم بداد

گفت کہ خور بادہ و خوش مژدہ — لاتخف و لیس جناحم بداد

گرچہ بجامم مے تقلید ریخت — لذت و مستی بصحا حم بداد

کاش کہ بودے بدلِ جانِ من — دردکہ[1] وردست و جناحم بداد

توبہ شکستم بہ شکستِ سبو — محتسبم فالِ فلاحم بداد

ساقیٔ ما جان و دلم شاد کرد — جرعۂ مے وقتِ صباحم بداد

ہیچ کسے را نہ سزد احتساب — ساقیِ مے عہدِ مباحم بداد

شکرِ خدائی کہ زِ روزِ ازل

درد و الم شام و صباحم بداد



[1] اس شعر میں اپنے بازو اور درد کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس زمانہ میں لاحق تھا۔

غزل



سوزِ غمہاے درونم در فراقت چوں کند | پارہ ہاے دل بچشمم آردو سرشک انہ خوں کند
آہِ آتشبارِ من سوزد جہاں را ابیگماں | چشمِ طوفاں زاے من از گریہ صد جیحوں کند
اُلفتِ تو در دلِ من یک متاعے باد و بس | انچہ باشد غیرِ تو خارِ غمت بیروں کند
رحمۃ للعالمیں را من شفیع آوردہ ام | زاں نمی ترسم کہ ایزد با گناہم چوں کند
زخمِ دل را چارہ سازم آں کہ مرہم بر نہد | دردِ دل را آں طبیبم کو دلم را خوں کند

در دیارِ ما چناں کس ہم زبانِ ما بود
در زمینِ ما فدائیؔ یک غزل موزوں کند



غزل



سرِ شوریدہ بہ سودا آمد | وحشتم با دبہ پیما آمد
جورِ بشکستنِ دل خوے تو بود | طرح دلداریم از ما آمد
قصۂ عشق و حدیثِ شبِ ہجر | سرگزشتِ منِ شیدا آمد
چوں گلِ من بہ سرشتند نخست | طرحِ دیوانۂ رسوا آمد
لذّتے بود مقرّر دمِ ذبح | شوق من حوصلہ پیما آمد
طرزِ ویرانگیٔ خانہ ببیں | کہ درش روکشِ صحرا آمد
خوبرویاں کہ دلم را بردند | خوش متاعیکہ بہ یغما آمد
جلوہ ام بود کہ شد سوزِ کلیم | خرمنم برقِ تجلا آمد

انچہ از زہدِ فدائی بودہ
در خمِ زلفِ چلیپا آمد



غزل



شیوۂ پیرِ مغاں را رنداں از بر کردہ اند
صحبتِ زہد و عبادت را ہمہ سر کردہ اند

ساقیاں خوش جامِ مے در آبِ ساغر کردہ اند
ماہ را ہم عکسِ روئے مہرِ انور کردہ اند

جان و دل ہر دو نثارِ پایِ دلبر کردہ اند
دین و ایماں ہم فدائے آں ستمگر کردہ اند

آنچہ باشد در جہاں آں را بدلہا دادہ اند
در خمِ ابروئے او دلہا مسخر کردہ اند

در محبت چارۂ دیگر نمی باید مرا
قطرۂ مے را علاجِ غم مقرر کردہ اند

در نصیبِ ما نشد یک بوسۂ لعلِ لبت
بنگر ایں یاقوت را کبریتِ احمر کردہ اند

سبزۂ خطِ تو باشد خضرِ راہِ مدعا
کاکلِ شبرنگ را سدِّ سکندر کردہ اند

در شبِ فرقت فدائی چوں ہما یادِ مے
ز آتشِ سوزِ دروں بالین و بستر کردہ اند



غزل



عاشق آن ست کہ دل دارد و جانے دارد — در دل و جاں طلبِ تیر و سنانے دارد
دردِ دل سوزِ جگر آہ و فغانے دارد — از پئے اہلِ خبر شوکت و شانے دارد
خنجرے در کفے بر دوش کفن می دارد — عشق زیبد اگر ایں طرز عیانے دارد
عاشق و بیخود و آوارہ و رسوا بدنام — عشق تام است اگر نام و نشانے دارد
شاہد و ساقی و مطرب ہمہ مطلوبِ من است — کیشِ من پیرویِ پیرِ مغانے دارد
دخت رز مایۂ خوبی ست بخواں ای ساقی — بزمِ مستاں ہمگی عیش کیانے دارد
داغ در سینۂ ما کلّہ بخورشید زند — چاکِ دل صورتِ صد کاہکشانے دارد
صفتِ پیرِ خرابات مپرس ای واعظ — رشکِ خضر است کہ او چشمۂ جانے دارد

چارۂ غم چہ کند فکر مداوا چہ کند
ایں فدائی کہ بسے دردِ نہانے دارد



قطعه

جان فدای علی محمد باد | کان محبت به استواری کرد
با من خستهٔ غریب وطن | دلدهی کرد و غمگساری کرد



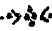
قطعه

مرده را زنده لب لعلش همی دم می کند | دخت تَرسا دعوی عیسی مریم می کند
لذت دردم فزاید چارهٔ هر صبح و شام | بین که از زخمم بیاید آنچه مرهم می کند



مطلع

من از پرده همی نالم که دردِ من عیان گوید | مرا رمزیست با جانان که چون پوشم همان گوید



قطعه

امتحان وفا نمودم چند | دوستان را من آزمودم چند
آنچه حال است کس نمی پرسد | از دعاها و از درودم چند



غزل

از دست بشد دل چو نگاہم بہ بر اُفتاد | چوں زلف بدیدم ہمہ غمہا بہ سر اُفتاد
کارِ عجبم در چمنِ دہر در افتاد | کز نخلِ مُرادم ہمہ برگ و ثمر اُفتاد
منّت کشِ عشقم کہ بیک نیم نگاہی | صد ناوکِ دلدوز بجان و جگر اُفتاد
چوں مرغکِ زیرک سخن مہر بہ سنجید | صیاد بگرو ید و بدامِ اثر افتاد
چوں ماہِ من از چہرۂ خود پردہ برافگند | از روے نظر جلوۂ شمس و قمر افتاد
مجنوں سبقِ دشت نوردی ز من آموخت | از جوشِ مئے عشق بجامِ دگر افتاد

اے بے خبر از حالِ فدائی کہ ندانی
شب چوں بہ سگِ کوے تو اورا گزر افتاد

غزل



دردِ تو بدل دارم بے چنگ و رباب اندر ای پردہ نشین عشقت دارد بحجاب اندر

در عشق دلے دارم، در آتش و آب اندر خونے بجگر دارم چون بو بہ کباب اندر

گہ نیستم و گہ ہستم ہشدارم و گہ مستم این ہستی بے معنی خوابست بخواب اندر

گہ ہیچم و گہ نازم گہ سوزم و گہ سازم شیبم بہ قرار اندر، جوشم بہ شباب اندر

قسّام ازل کردہ تقسیم بہ قدرِ دل معشوق بناز اندر، عاشق بعتاب اندر

غافل نہ برد فیضے از صحبتِ ہشیاران باشد پرطاؤسے عمرے بہ کتاب اندر

صد نغز بہ یک لفظے، صد لفظ بیک نغزے حسنش بہ سوال اندر، عشقم بجواب اندر

خواہد کہ بپوشاند رازے کہ بہ رو دارد این موئے سپیدِ خود، واعظ بخضاب اندر

این راز بہ میخانہ ظاہر بہ فدائیؔ شد

ہستی بہ جہان بسی مستی بہ شراب اندر



غزل



صبحدم می خور و محوِ رُخِ جاناں برخیز
مستُ لایعقل و خود رفتہ و نالاں برخیز

صفتِ دیدہٴ نرگس بہ تماشائے جہاں
چشم بکشا و نگاہے کن و حیراں برخیز

دل گرفتہ منشیں فصلِ گل است ای ساقی
شرطِ عقل ست کہ از توبہ پشیماں برخیز

تختِ دل سوئے نسیم آمد جاں می خواہد
ای بہارِ چمن و عیسیِ دوراں برخیز

پیشم آمد بسرِ کوچہ پری رخسارے
کافرے عشوہ گرے زلف چو زنّار بدوش

گفتم ایں کوے چہ کوئیست ترا خانہ کجاست
ای مہِ نو خمِ ابروے ترا حلقہ بگوش

ای کہ سر رشتہٴ صبرم بدلم می پیچد
لب کشا و ز خودم دہ خبرے گفت خموش



غزل



درحریم کعبہ شو یا محرم بتخانہ باش
هرچہ باشی باش اما بیخود و دیوانہ باش

حاصلت از زندگانی ز نوبت هیچ نیست
باش در قید مذلت چند روزے یا نہ باش

گوشۂ عزلت گزین و چشم از عالم بپوش
چوں خضر از خلق و عالم پاک و آزادانہ باش

از طواف کعبہ باز آ بگزر از شیخِ حرم
خدمتِ پیرِ مغاں کن بر درِ میخانہ باش

یا بدہ زہرِ ہلاہل یا بدہ جامِ وصال
یا بمن پیوستہ باشی یا زمن بیگانہ باش

عارفی در عشق و الفت مستی و لایعقلی
در طریقِ شرع و آئینِ عاقل و فرزانہ باش



غزل



دلے دارم عجب از کار فارغ
هم از یار و هم از اغیار فارغ

نہ باشد یار از اغیار فارغ
نہ بینم ہیچ کس از یار فارغ

سر شوریدہ را بہ شکستم اینک
شد از کارم در و دیوار فارغ

بپوییم من رہِ عشق و ملامت
هم از آساں هم از دشوار فارغ

مصیبت در پئے ہر راحتے ہست
کجا باشد گلے از خار فارغ

ندارم صورتے جز دوست در دل
منم از منّت اغیار فارغ

دلِ قاروں بحسرت می برد رنج
کہ مفلس از غمِ دینار فارغ

محبّت کرد شیخ و برہمن را
ز قیدِ سبحہ و زنّار فارغ

فراغت مایۂ صد بیخودیہاست
بود ہر بیخود از ہشیار فارغ

نہ خواہم من شوم منت کشِ درد
شدم از لذّت آزار فارغ

فدائی آں چناں از دل گسستم
کہ شد مارا نفس از تار فارغ

نظم

اے وزیر الحسن حبیبِ شفیق	اے عزیزِ وطن حبیبِ شفیق
یادِ احباب و یادگارِ عزیز	خوش نشانِ وطن حبیبِ شفیق
برطرف از ہمہ تکلفہا	ای بہ ہر انجمن حبیبِ شفیق
خانہ ات خانہ بے تکلفِ من	من بہ تو، تو بہ من حبیبِ شفیق
خلق را جملہ خانوادۂ تو	یعنی ہر مرد و زن حبیبِ شفیق
کرد تاثیرِ شہرتِ نامت	لکھنؤ را بہ من حبیبِ شفیق
من بجاے تو، تو بجاے من	تن بجاں، جاں بہ تن حبیبِ شفیق

جز خدا ہیچ نیست مقصودے
یاد دار ایں سخن حبیبِ شفیق

غزل

به لیلیٰ گفت مجنوں می تپد دل — بگفتا بینمت چوں می تپد دل

به شوقِ باده در خوں می تپد دل — ز حد وسع بیروں می تپد دل

بدردِ عشق چوں همدرد بودند — پئے فرہاد و مجنوں می تپد دل

بقیدِ تنگنائے ضبط تا کے — برائے کوه و ہاموں می تپد دل

بدامِ کاکلِ پیچاں فتنه جاں — بتابِ زلفِ شبگوں می تپد دل

حدیثِ عشق تا تکرار کردند — به الفاظ و به مضموں می تپد دل

رباید عقل کو زہر غمش را — ز تریاقِ فلاطوں می تپد دل

کلامِ خوب و رنگیں جاں فزاید — به شعرِ نغز و موزوں می تپد دل

چو مرغِ قبله رو دارم بکویش — مرا در سینه افزوں می تپد دل

شنیدستم که مستی غم رباید — من آں مستم که افزوں می تپد دل

لئیمِ بوالهوس دیدم که اورا — به جمعِ گنجِ قاروں می تپد دل

ترا دیدم فدائیؔ با همه درد
به بذلِ جانِ محزوں می تپد دل

غزل



ساقی سے مئے لعل فام خواہم
مے خواہم وہاں مدام خواہم

آوارۂ کوے عشق تا کے
وقت است کہ ننگ و نام خواہم

ز آغوش وصال و بوسہ از لب
دایم طلبم، مدام خواہم

یک جرعہ ز بادۂ محبت
خواہم من تشنہ کام خواہم

در ابروے تو شکن نہ زیبد
شمشیر تو بے نیام خواہم

آوارۂ و ہرزہ گرد و بدنام
حیرت زدہ ام چہ نام خواہم



غزل



چہ ہاے وہوے خوش مستانہ کردم | تولائے مے و میخانہ کردم
بتاب شمع روئے مجلس قدس | دلِ شوریدہ راپروانہ کردم
مہ و خورشید گردیدند با من | چو دورِ ساغر و پیمانہ کردم
بدل عشق بتِ کافر گزیدم | حریم کعبہ را بتخانہ کردم

ز زہد و طاعت و طامات و رندی
فدائی توبہ مردانہ کردم



غزل

کفر و ایماں من ندانم عشق را رہبر کنم
جان ہم دل کے فدائے نام آں دلبر کنم

کافر عشقم مرا از زہد و تقوی کار نیست
جائے قرآں مبیں تصویر تو در بر کنم

من بآب از غوانی آب حیواں میخورم
من تلاش خضر کی مانند اسکندر کنم

از شکستن جوہر اصلی نہ ہر گز بشکند
تیغ را خنجر کنم یا شیشہ را ساغر کنم

محتسب امن نہ ترسم عہد توبہ بشکنم
من کہ پیمان وفا با شاہد و ساغر کنم

آہ بر من از تطاول ہائے شبہائے فراق
شب ہمہ من در شمار کوکب و اختر کنم

صد شباب و شیب را در یک نفس طوفاں زند
طفل اشک خویش را از چشم بیروں گر کنم

ناوک تیز نگاہ تو کہ بر من می فتد
در جگر صد آبلہ، در سینہ صد نشتر کنم

در خرابات جہاں ہر گز نیابی داد دل
حیف باشد اے فدائی گر ہوس دیگر کنم

مطلع



خوش جلوہ کرد ساعدِ زیبا در آستیں　　پنہاں درون دیدہ و پیدا در آستیں

زیں پیشتر بہ طینت دریا و ابر بود　　بیہودہ گریہ کردن و بیجا گریستن

دریا کجا سلیقۂ ماتم شناختے　　ابر از کجا تواں بہ تمنّا گریستن

دیدہ است بحر چشم مرا موج خوں زدن　　آموختہ ست ابر تر از ما گریستن

الا بہ ماتم و غم افضال می تواں　　دریا بہ ابر و ابر بہ دریا گریستن

گہ ناصبور گریم و گہ ضبط می کنم　　آید ز من گریستن و نا گریستن

خوں از جگر چکیدن و دل خوں شدن غم

آتش ز دیدہ ریختن و یا گریستن



غزل

مست الستِ بادۂ دوشینہ نوش کن
ایں جانِ زار نذرِ می و می فروش کن

بر حالِ من بگرید و سوزد بدردِ من
می زیبدت کہ شمع مزارم خموش کن

پیرِ مغاں ملامتِ رندان نمی کند
ای محتسب تو ہم نظرِ عیب پوش کن

عالم فضائے عبرت و آوازۂ فنا
برخیز و خویش را ہمہ تن چشم و گوش کن

خواہی اگر فسانۂ دلدادگاں شنید
افسانۂ فدائی دلدادہ گوش کن

تضمین بر غزل حافظ شیرازؒ

وقت خوش است موسم گل فتحِ باب کن
در بارگاہِ میکدہ ام باریاب کن
مارا بیک دو جرعۂ مست و خراب کن
صبح است ساقیا قدحے پُر شراب کن
دورِ فلک درنگ ندارد شتاب کن

پیری رسید، ماتم عہدِ شباب کن
لیکن نگویمت کہ زمی اجتناب کن
وقت است وقت در طلبش اضطراب کن
صبح است ساقیا قدحے پُر شراب کن
دورِ فلک درنگ ندارد شتاب کن

صوم است صوم حرمتِ اُم الکتاب کن
لیکن شبے بہ دختِ رزم بے حجاب کن
عید است عید، بذلِ شراب و کباب کن
صبح است ساقیا قدحے پر شراب کن
دورِ فلک درنگ ندارد شتاب کن

مارا بہ عشق و رندی و مستی خطاب کن
مستم بہ بانگِ بط و چنگ و رباب کن
بہرِ خدا رعایتِ عہدِ شباب کن
صبح است ساقیا قدحے پُر شراب کن
دورِ فلک درنگ ندارد شتاب کن

من در پے تلاش مباحات نیستم پابند حرز و ورد و مناجات نیستم
گوئی مرا کہ مست خرابات نیستم ما مرد زہد و توبۂ و طامات نیستم

با ما بہ جام و بادۂ صافی خطاب کن

ما پردۂ ز روے حقیقت کشودہ ایم بہ نجتیم زروزِ ازل وانمودہ ایم
عمرے شدم کہ در پے خوے تو بودہ ایم ما بختِ خویش و خوے ترا آزمودہ ایم

با دشمناں قدح کش و با ما عتاب کن

در بارگاہ داور دادار کبریا تو نیز اے فدائیٔ خستہ جگر بیا
دست دعا دراز کن از بہرِ مدعا حافظ وصال می طلبد از رہِ دعا

یارب دعاے خستہ دلاں مستجاب کن

عالم بجاے خود بود یک کاسۂ حباب چشم بہی مدار زکم ظرف ناصواب
یک ساغرِ شراب بدہ ساقیا شتاب زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب

ما را بہ جام بادۂ گلگوں خراب کن



غزل



با دلِ شوریدۂ و با چشمِ گریاں زیستن — مشکلے باشد بہ دردِ ہجر آساں زیستن

مرگِ من در ظاہر و باطن بود مرگِ نشاط — من نہ پیدا زیستن خواہم نہ پنہاں زیستن

در تمنّائے وصال و در غمِ ہجر و فراق — مردن است از بہرِ جاناں بہرِ جاناں زیستن

عمرہا کردم بسر ہرگز نیامد در نظر — چوں سزد در جستجوئے مہرِ خوباں زیستن

یک نگاہ شوخ تو کافی ہست بہرِ قتلِ من — کی بود در سایۂ چشمِ غزالاں زیستن

مرگِ من از من نباشد جز بحسرت جاں سپر — زیستن بنود زمن امّا پشیماں زیستن

اے فدائی خوش بود دیوانگی و بے خودی
پاک دامن مردن و آلودہ داماں زیستن



مدح



شاد باشی شاد ای مرزا سمیع اللہ بیگ   تلخ کامِ زندگی را آبِ حیواں دادهٔ

آمدم بر درگہت ناخواندہ مہمانت شدم   با خلوصے احترامِ خاص مہماں دادهٔ

اے ترا شغلِ وکالت سازگار و کامگار   لکھنؤ را عزّتِ بے حد و پایاں دادهٔ

روزہا در خدمتِ خاصانِ حق پیمودهٔ   شب ہمہ شب بہرِ یادِ خاصِ یزداں دادهٔ

خلقِ تو یک پرتوے در مبدءِ فیاض ہست   دل بخاطر داریِ گبر و مسلماں دادهٔ

ہیچ فخرت نیست یونیورسٹی را ممبری   بلکہ از فیضِ قدومش عزّت شاں دادهٔ

دردمند قوم و غمخوارِ جہاں باشی و باش   ہمچو عیسیٰ قومِ مردہ را اگر جاں دادهٔ

در محبت حرمتِ گبر و مسلماں دادہ   در جگر آتشکدہ در سینہ ایماں دادهٔ

دولتِ عشق و محبت در دل و جاں دادهٔ   چاک داماں سینہ بریاں دیدہ گریاں دادهٔ

آفریں بر تو فدائی باد در ہندوستاں

خامہ را شیریں بیانیِ صفاہاں دادهٔ



قطعہ



پند بگوئی مگر اے پندگوئے | پند نخست از منِ دیوانہ جوئے
پند بود در خور فرزانگاں | از من دیوانہ عبث آرزوئے



قطعہ



بیچارۂ مبتلائے دردے | غمخوار کسے نہ دردمندے
گویند فدایت حزین است | با نالۂ گرم و آہ سردے



غزل



یار دارم عجب جفا کارے | دلبرے جانستانؔ دل آزارے
سروکارِ تو با جہاں لیکن | کاش بودے بمن سروکارے
من بجاں می خرم متاعِ وفا | لیک نایذ بہ ہیچ بازارے
مایۂ دین و دل بغارت برد | آں جفا پیشہ ستمگارے
ہیچکس را نہ ماند کار از من | با کسے نیست مرمرا کارے

نگہ لطف اے طبیبِ عشق
با فدائیؔ غریب و بیمارے



غزل

ای چشمِ تو مستِ خواب تا کے
با من نگہ عتاب تا کے

از ہستیِ خود خبر نہ دارم
با عاشق خود حجاب تا کے

دادہ سبقم جنون و مستی
ناصح، سخن از کتاب تا کے

اے صبر و سکوں قرار تا چند
اے دردِ دل، اضطراب تا کے

تلخابہ بیار و ساغرم دہ
ساقی ہوسِ شراب تا کے

از داغ جگر شمار تا چند
از زخمِ دروں حساب تا کے

از جور و جفا، سوال تا چند
از ناز و ادا، جواب تا کے

چوں برق کنیم زندگانی
اے عمرِ رواں، شتاب تا کے

در کوئے ملامت اے فدائیؔ
رُسوائے دلِ خراب تا کے

اشعار متفرق

الا یاد فرمائی یاد آوری — بیاد منت آئی یاد آوری

فراموش من کرده ام جمله یاد — مگر یاد تست اے یار تو یاد باد

بگیتی بیادِ تو شاد آمدم — ترا یاد کردم به یاد آمدم

شب و روز شد یادِ تو کارِ من — ترا یاد کردن سزاوارِ من

مرا نیست جز یادِ تو هیچ کار — که یادِ تو باشد مرا زنده داد

بیادِ تو گر زندگانی کنم — بدین زندگی شادمانی کنم

بمن مهر فرما و از من مرنج — ز کارِ خطایم مشو شکوه سنج

مجوئی ز اندیشهٔ کارِ من — نه پرسی ز انجامِ هنجارِ من

ز درد و الم بودِ ما کرده اند — زیان صورتِ سودِ ما کرده اند

تب و غم نهادند اندر قریح — چنان آفریدند ما را صریح

به صبر و سکون بگذرد حالتم — بدینسان نباشم اگرچه ز بیم

دل از دست چون تیر از شست رفت — من از کار و کارم از دست رفت

نہ جویم ازیں گل دگر رنگ و بو   مرا نیست جز یادِ تو آرزو

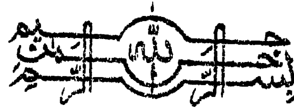
ہوس دارم از یار و از جور یار

مرا یاد دارد بدیں روزگار



حصّہ دوم

اُردو



ساقی نامہ



پلا ساقیا مجھ کو اک جامِ درد　　رہوں زندگی بھر سے آشامِ درد

مرا دل مرا رنج سہتا رہے　　سدا اشک آنکھوں سے بہتا رہے

میں کھینچا کروں ہر نفس آہِ سرد　　ہمیشہ رہے رنگ چہرے کا زرد

یونہیں چوٹ دل کی اُبھرتی رہے　　یونہیں زندگانی گزرتی رہے

مرا دل رہے وقفِ درد و الم　　رہوں میں اسی طرح مشقِ ستم

مرا دل تپِ غم سے جلتا رہے　　اسی طرح یہ دور چلتا رہے

زمانہ برابر ستایا کرے　　کوئی ہر گھڑی دل دکھایا کرے

وہ غم ہو کہ ہر دم کراہا کروں　　مگر درد کو دل سے چاہا کروں

وہی درد ہو میرے غم کا علاج　　اسی درد کی ہو مجھے احتیاج

مرض ہو تو دردِ دروں کا مرض　　مرض ہو تو جوشِ جنوں کا مرض

مرض ہی مرے واسطے خود دوا — مرض ہی میں دائم رہوں مبتلا

مُے درد ساقی پلا دے مجھے — مزہ درد دل کا چکھا دے مجھے

وہ مے دے کہ بس جان کھویا کروں — اسی طرح دن رات رویا کروں

وہی درد و غم کیفِ بادہ رہے — وہ مے دے کہ وحشت زیادہ رہے

مرا ذکر صحرا بہ صحرا کریں — مجھے اپنے بیگانے رسوا کریں

وہ مے دے کہ دل درد آگاہ ہو — سدا لب پہ نالہ ہو اور آہ ہو

کہاں ہی تو اے ساقیِ تیز ہوش — کہاں ہی تو اے محرم رازِ دوش

خبر ہی تجھے کچھ مرے درد کی — مرے اشکِ گرم اور دمِ سرد کی

مرے ساقیِ مہرباں نیک پے — پلا دے مجھے خم کے خم پھر وہ مے

رہوں جرعۂ درد کا تشنہ کام — رہے بادۂ عیش مجھ پر حرام

مجھے بادۂ درد آمیز دے — جو کچھ تجھ کو دینا ہو وہ تیز دے

وہ مے دے کہ لذّت دہِ غم رہے — وہ مے جس میں آمیزشِ سم رہے

مجھے بادۂ حسرتِ درد دے — پیاسا ہوں دے شربتِ درد دے

جیوں میں تو گرمِ تمنّائے درد — مروں بھی تو بہرِ تماشائے درد

اسی درد کے رنج سہتا رہوں — اسی درد کو درد کہتا رہوں

پلا ساقیا مے کہ وہ چپ سے لگے　　نہ کچھ کہہ سکوں میں نہ کوئی سنے

زبس مجھ کو ہے عشقِ پردہ نشیں　　مرا راز کھلنے نہ پائے کہیں

تپِ غم مرے آب و گل میں رہے

مرا درد ہی میرے دل میں رہے



غزل



حرفِ مطلب سوال سے چھوٹا — مدّعا، عرضِ حال سے چھوٹا
شکرِ اندوہِ ہجرِ یار کہ میں — آرزوے وصال سے چھوٹا
خوش ہوں دیوانہ بن کے ای واعظ — تیری بحث و جدال سے چھوٹا
ہو کے سرمستِ بادۂ الفت — فکرِ جاہ و جلال سے چھوٹا
دین و دل نذرِ یک نگہ کرکے — فتنۂ خط و خال سے چھوٹا

کرکے سر نذر اسے فدائیؔ تو
زندگی کے وبال سے چھوٹا



غزل



نگاہِ ناز سے تیری بچا کیا — قدر کہتے ہیں کس کو اور قضا کیا
ہماری بے دلی تیرا تغافل — جفا کیا چیز اُمیدِ وفا کیا
تری شوخی نے ای جان مار ڈالا — تلافی و مکافاتِ جفا کیا
تجھے تو ہاتھ رنگنے سے ہی مطلب — ہمارا خون کیا رنگِ حنا کیا

فدائی اس تری جانِ حزیں پر
ستم کیا، ظلم کیا، جور و جفا کیا



غزل ناتمام



دور اب دل سے سرگرانی کر　　　مہرباں مجھ پہ مہربانی کر
نامہ بر میں نے پڑھ لیا نامہ　　　بات اب مجھ سے کچھ زبانی کر

حالِ دل اُن پہ ہو چکا ظاہر
کچھ بیانِ غمِ نہانی کر



غزل

دل میں پھر پیدا ہوا سوز و گداز	ہی کسی بیدرد سے راز و نیاز
خواب میں آتا نہیں وہ مستِ ناز	نیند سے ہو جاؤں میں بھی بے نیاز
میں کہاں اور صحبتِ بنت العنب	میں گرفتارِ ہوس وہ پاکباز
چشمِ ساقی کا اشارہ ہی یہی	چاہیئے زہد و ریا سے احتراز
بوسۂ لعل لب و جام شراب	ساقیِ شیریں ادا و دل نواز
نیم بسمل کی طرف ترچھی نگاہ	اے نگاہِ ناز چشمِ نیم باز
ہو طلب صادق تو پھر رہتا نہیں	عشق میں اور حسن میں کچھ امتیاز

مجھ کو اس سے بدگمانی کیوں نہ ہو
غیر سے رکھتا ہی وہ راز و نیاز

غزل



نہ ہوئی اصل حقیقت معلوم
غیر موجود کو سمجھے موہوم

لاکھ عالم میں حقائق کی ہی دھوم
ہم کو ہی سب کی حقیقت معلوم

اس کا خنجر ہو مرا ہو حلقوم
ایسی تقدیر کہاں ای مقسوم

خدمتِ پیرِ مغاں سے ساقی
رندِ میکش بھی بنیں گے مخدوم

ہم بھی بن جائیں گے افسانہ کبھی
لوگ ہم کو بھی کہیں گے مرحوم

جلوہ ہوتا نہیں بے ذوقِ نگاہ
حسن اور عشق ہیں لازم ملزوم

چشم ساقی سے ہی شکوہ ہم کو
پیاسے اور دور میں تیرے محروم



غزل



گئے دین و دل سوئے پردہ نشیں — بنا رہ گزر کوئے پردہ نشیں

تمھیں کس نے بیتاب موسیٰ کیا — مگر جلوۂ روئے پردہ نشیں

قیامت ہی مشتاقِ نادیدہ کو — سہی سروِ دلجوئے پردہ نشیں

تنِ کشتہ نے جان مشکل سے دی — زہے دست و بازوئے پردہ نشیں

مرے چھپ کے آنے سے پردہ کھلا — کہ ہی عشقِ بانوئے پردہ نشیں

چھپاتا ہوں میں رازِ دردِ دروں — پسند آگئی خوئے پردہ نشیں

فدائی بلائے دل و جاں سہی
خط و خال و گیسوئے پردہ نشیں



غزل



بوالہوس ہوں گے جو کہتے ہیں ستم کرتے ہیں
سچّے عاشق پہ تو معشوق کرم کرتے ہیں

آہ ناکامیِ دل، ہائے ہجومِ اندوہ
دیکھیں کس طرح بسر ہم شبِ غم کرتے ہیں

ایک وہ ہیں کہ ستم توڑ رہے ہیں ہم پر
ایک ہم ہیں کہ سمجھتے ہیں کرم کرتے ہیں

تیرا خنجر ہی کہ ہر لحظہ کمی کرتا ہی
اپنی گردن ہی کہ ہر بات پہ خم کرتے ہیں

طاعتوں کا نہ صلہ ہی نہ گنہ کی تعزیر
یہ بھی ہی کوئی خدائی جو صنم کرتے ہیں

جان دی کیا کسی دل سوختۂ بیکس نے
رنج کس کا ہی کہ وہ آنکھوں کو نم کرتے ہیں

کچھ نہ بن آئی تو پھر صبر و سکوں کی ٹھہری
وہی ناصح کو بھی کرنا ہی جو ہم کرتے ہیں



غزل ناتمام



پھر مورِدِ صد غم و بلا ہوں　　پھر درد میں مبتلا ہوا ہوں

حادث ہی مرا نظامِ ہستی　　میں نقش بساطِ ماسوا ہوں

پھل لائے ہمارا نخلِ اُمید

کیا غیر کا کوئی مُدّعا ہوں



غزل

رہزنِ دل ہیں ستمگر گیسو — دشمنِ دیں ہیں یہ کافر گیسو

سر چڑھے رہتے ہیں دیکھیں کب تک — خودسری کرتے ہیں بڑھکر گیسو

کیوں پریشاں ہو بگڑتے کیا ہو — دل مرا لے لو بنا کر گیسو

خوابِ ہستی کی ہے اُلٹی تعبیر

کہیں بگڑیں نہ سنور کر گیسو!

غزل



ساقی مئے لالہ زار دیدے ساقی مئے غم گسار دیدے

دل میں مرے ایک آگ بھردے نالوں میں مرے شرار دیدے

آجائیں کبھی تو فاتحہ کو کچھ جذب سر مزار دیدے

دنیا سے ہوتا کہ مجکو عبرت ساقی مئے اعتبار دیدے

اب ختم ہی دورِ زندگانی ساغر کوئی مستعار دیدے

لذّت سے غرض نہیں ہی مجھکو

تلخابۂ ناگوار دیدے

غزل



جینا آزار ہوگیا ہے — مرنا دشوار ہوگیا ہے
جو نخلِ مراد تھا ہمارا — وہ بید و چنار ہوگیا ہے
جو داغِ وفا تھا دل میں روشن — وہ شمعِ مزار ہوگیا ہے
غارت کیا جس کو تو نے اے عشق — وہ صبر و قرار ہوگیا ہے
سرمایۂ نشۂ جوانی — پیری میں خمار ہوگیا ہے
کچھ ٹھیک نہیں دل و جگر کا — جب سے غمِ یار ہوگیا ہے
وہ زخم مرے دل و جگر کا — پھر نذرِ بہار ہوگیا ہے

پھر صیدکِ ناتواں فدائیؔ
چتون کا شکار ہوگیا ہے

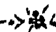


غزل



جوانی گئی زندگانی گئی — وہ قصّہ گیا وہ کہانی گئی
مجھی تک تھا سب شکوۂ زندگی — نہیں ہیں تو سب بدگمانی گئی
ہی ناتوانی سے اب جان پر — توانائیِ سخت جانی گئی
کوئی کس پہ آخر بھروسا کرے — محبّت گئی مہربانی گئی
ہوئے ذبح تیغِ تغافل سے ہم — وہ مرگِ دمِ ناگہانی گئی
تمھیں دیکھ غش کر گیا، نامہ بر — مجالِ پیامِ زبانی گئی

ہوئے اُن کو مرغوب اشعارِ غیر
فدائی تری لن ترانی گئی



غزل

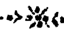


دل دردپسند ہوگیا ہے
وقفِ غمِ چند ہوگیا ہے

ہم دل شدگاں کے دردِ دل کا
نالہ پابند ہوگیا ہے

وہ اور کمالِ حسن، دریا
اک کوزہ میں بند ہوگیا ہے

جان دیتے بہائے بوسہ لیکن
دل اُن کو پسند ہوگیا ہے



غزل

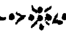


اس اپنی فقیری میں نہ کچھ مال نہ زر ہی — تھا اک دلِ آگاہ وہ اللہ کا گھر ہی
اس غم کدۂ دل میں نہ دیوار نہ در ہی — جی چاہے چلے آؤ یہ اللہ کا گھر ہی
ہم سمجھے ہیں کچھ نفیِ حقائق کے طلسمات — معشوق وہ ہی جس کے دہن ہی نہ کمر ہی
اُس راہ کا رہرو ہوں خضر جس میں ہیں گمراہ — جز منزلِ مقصود حضر ہی نہ سفر ہی

کیا بات ہی جنبش میں ہی کیوں عرشِ معلّٰی
کیا نالۂ و فریادِ فدائیؔ کا اثر ہی



غزل



نہ تمنا ہی بجز اس کے نہ ارماں کوئی
درد وہ دل میں ہے جس کا نہ ہو درماں کوئی

آدمیت نہ کہیں ہے نہ ہی انساں کوئی
زندگی لطف سے گزرے نہیں ساماں کوئی

نامہ بر ہم نے تو سمجھا تری صورت سے جواب
اس طرح سے کہیں ہوتا ہی پشیماں کوئی

لاکھ پردے میں ہے اے دختر رز مستوں سے
راز اس دلنشیں کا نہیں پنہاں کوئی

نہ بچیں تجھ سے میں صدقے ترے اے دست جنوں
جوش وحشت میں ہے جیب نہ گریباں کوئی

کون غم خوار ہے کس سے کہیں ہم تیرے سوا
اپنا ہمدرد نہیں اے شب ہجراں کوئی

نقد اور جنس گراں دونوں میں ہے آفت قحط
جنس عصیاں کے سوا اب نہیں ارزاں کوئی

اس زمانہ میں فدائی ہے عجب قحط رجال
نہ سخن فہم ہے کوئی نہ سخنداں کوئی



غزل

ذبح پر پھر جو وہ مائل ہوتے ہم تناسخ کے بھی قائل ہوتے
جوشِ وحشت کا برا ہو یارب کاش ہم پا بسلاسل ہوتے

تھی اجابت ہدفِ تیرِ دعا
اس کو ہم پاتے جو سائل ہوتے

غزل

محبت کبھی آزمائی کسی کی
کبھی دل میں الفت سمائی کسی کی

یہی سب ہیں اسباب غارت گر دل
محبت کسی کی جدائی کسی کی

بہت دن میں یہ آج سمجھا ہے میں نے
قیامت ہے بے اعتنائی کسی کی

ہیں ظالم بتوں کی نرالی ادائیں
نہیں کرتے حاجت روائی کسی کی

مقدر کی برگشتگی ہم نے دیکھی
برا ہو جو چاہیں بھلائی کسی کی

نہ حل ہو سکا ایک عقدہ بھی دل کا
کیسی ہے مشکلکشائی کسی کی

وہ اک منزل قدس ہے سب سے اعلیٰ
کہاں اس کے در تک رسائی کسی کی

اسے اپنے ہی حال سے کب ہے فرصت
کسی سے کہے کیا فدائی کسی کی

غزل



تھا غلط موسیٰ کہ جلوہ چاہیئے — دیدِ حق کو چشمِ بینا چاہیئے

کچھ غرض یاں عشق و الفت سے نہیں — موت کو بس اک بہانا چاہیئے

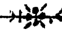
زندگانی ہے فقط نقشِ بر آب — اتنی سی مدت میں کیا کیا چاہیئے

ہم سے کھلتے ہو تو غیروں سے چھپو

حسن کو یک گو نہ پردا چاہیئے



غزل



اہلِ دُنیا کے سبب رسوا ہوئی ۔۔۔ ورنہ دنیا مزرعِ عقبیٰ ہوئی

جتنی ہی بوڑھی ہوئی پُرفن بنی ۔۔۔ دختِ رز بھی قحبۂ دُنیا ہوئی

درد بازو میں ہوا دل کی جگہ ۔۔۔ جب سے حبِّ ساعدِ زیبا ہوئی

ہم نہیں مجنوں کہ ہوں آوارہ گرد

کوے جاناں منزل و ماویٰ ہوئی



غزل ناتمام



پیری میں دُخترِ رز نوخیز چاہیے　　دورِ اخیر جام ہی لبریز چاہیے

ہوتی نہیں ہی قطع، یہ منزل سخن کی ہی　　اس راستہ کو فکر کا شبدیز چاہیے

جلتا ہی آتشِ غمِ ہجرِ صنم سے کیوں

مسلم کو ایسی آگ سے پرہیز چاہیے



غزل



ٹوٹا نہیں تارِ زندگانی
اللہ رے زورِ ناتوانی

وہ رندی و مستی و جوانی
ساقی و شرابِ ارغوانی

یعقوب سے ہو سکی نہ تعبیر
وہ خواب ہی قصۂ جوانی

میرے لیئے وعدۂ نظارہ
موسیٰ سے خطابِ لن ترانی

میں ہوں کہ بلاکش و بلاگرد
تو ہی کہ بلائے آسمانی

مجذوب کی بڑھی یا غزل ہی
الفاظ ہیں خالی از معانی

ہیں حاصلِ زندگی فدائی
دردِ جگر و غمِ نہانی



ایک واقعہ



فنجانِ عرب سرائے دینا   وہ شاہیِ مشکنائے دینا
دل سرد ہی۔ گرم گرم ساقی   صہبا کے عوض میں چائے دینا
کچھ قید نہیں ہی ہو کہیں کی
جو چائے ہو دیدہ پا سے دنیا



انتخاب ممبری میونسپلٹی جونپور



ساقی بتا یہ کس کے الکشن کا دور ہو
بدمستیوں سے کس کی ہی عالم کو پیچ و تاب

کیا قرض کی پلائی کسی مے فروش نے
یا مل گئی ہو آج کہیں مفت کی شراب

کس کو تھا اپنی کوشش بیجا پہ یہ گھمنڈ
کس کو تھا اپنے کام میں اس درجہ اضطراب

مے کش تجھی کو دیں گے دعا تیرے عہد میں
گردش میں ماہتاب ہی چکر میں آفتاب

پوچھا جو میں نے پہلے وہ خاموش ہو رہا
پھر مسکرا کے اس نے دیا مجھ کو یوں جواب

عاشق کشید بادہ خم ہوا لہوس شکست
پہلا تو پی کے مست ہوا دوسرا خراب



ایک تاثر

عشق و الفت کا ماجرا کہدیں — زندگی میں جو کچھ ہوا کہدیں
ہم نہ ہوں گے تو کون پوچھے گا — آپ ہم اپنا مرثیا کہدیں

ایک واقعہ

دوست ہیں اور مجھ پہ مہر افگن بھی ہیں — ہیں عدو بے مہر، اور بدظن بھی ہیں
درحقیقت اے فدائی بے خبر — دوست بھی ہیں مجھ سے اور دشمن بھی ہیں

قطعہ



لکھنؤ آؤ تم جو باہر سے　　کچھ نہ پوچھو نہ کچھ زباں سے کہو

گھر کی تم کو اگر ضرورت ہو　　جا کے صادق حسین خاں سے کہو

ڈاکٹر کی اگر ضرورت ہو　　مڈیکل ہال کامراں سے کہو

گر طبیبوں کی تم کو حاجت ہے　　ہر گلی میں ملیں جہاں سے کہو

چاہتے ہو اگر علاج کرو　　تو طبیبِ مزاج داں سے کہو

عیسیِ وقت ہیں کمال الدین　　ہاں انہیں عیسیِ زماں سے کہو

گر وکیل اور کونسل چاہو　　یکہ بانانِ رازداں سے کہو

گر مدرس کی ہو تلاش تمہیں　　طالب علم نکتہ داں سے کہو

تھی فرنگی محل میں دولتِ علم　　جا کے اس گنج رائگاں سے کہو

ذاتِ عین القضاۃ کی تعریف　　کم ہے جو کچھ بھی تم زباں سے کہو

پوچھنا ہو جو حال کالج کا　　کسی مجروحِ امتحاں سے کہو

گل کا نظارہ ہو اگر کرنا — بلبل شکّریں زباں سے کہو
چوک کی سیر بھی جو کرنا ہو — تو کسی اپنے مہرباں سے کہو
آصف الدولہ اور حسین آباد — ان کو تعمیر جاوداں سے کہو
اللہ اللہ رے سیر حضرت گنج — اس کا احوال کس زباں سے کہو
دیکھ لو گر کہیں امین آباد — اس کو اک تختۂ جناں سے کہو
قصّۂ گلشنِ سکندر باغ — نخل بندانِ کارداں سے کہو
لطف فوارہائے گوہر ریز — لبِ جوئے گل رُخاں سے کہو
شہر کے پُر فضا مناظر کو — پیر کیا سمجھے نوجواں سے کہو
عشوۂ و نازکی حکایت کو — کسی مجروحِ نیم جاں سے کہو
دخترِ رز ہو پیشِ پیرِ مغاں — کیوں نہ بدمستِ نوجواں سے کہو
حالِ بے پردگی نسواں کو — دخترِ نوخیز و نوجواں سے کہو
شادیاں کورٹ شپ سے ہونگی اب — کیا ضرورت ہے باپ ماں سے کہو
جب پسند آئے میل جول کے بعد — تب کہیں گے کہ ہاں فلاں سے کہو
جب سیکھیں گے ایسی تہذیبیں — بال ہیں نا چیں کے کہاں سے کہو
کیوں سکھایا یہ طرز آزادی — جا کے بی بی سے اور میاں سے کہو

دیکھ لو جلسہائے مسلم لیگ — غیرتِ نام آوراں سے کہو

جلسہائے رفاہِ عام میں جاؤ — اپنے احباب و مہرباں سے کہو

حال دارالعلوم ندوہ کا — شبلیِ جنّت آشیاں سے کہو

اہلِ دل کی اگر تمنّا ہو

اس فدائیِ خستہ جاں سے کہو



طبع دیوان آسی پر



حضرتِ آسی مرحوم کا دیوانِ شریف　حسن و خوبی سے ہوا جمع کہ سبحان اللہ
اہلِ فن، اہلِ خرد نے پئے تصحیح کلام　کوشش و سعی کی تا وسع کہ سبحان اللہ
بعد ترتیبِ کلام و پس تصحیحِ تمام　ہر شک شبہہ ہوا دفع کہ سبحان اللہ
عالمِ حُسنِ معانی میں ہے خورشیدِ کمال　بزمِ لفظی میں ہے اک شمع کہ سبحان اللہ

سالِ طبعش زسرِ وجد بگفتا ہاتف
خوب و نایاب شدہ طبع کہ سبحان اللہ



مطلع

قاضی کو احتساب کی ساقی مجال تھی
پی ہم نے وہ شراب جو پہلے حلال تھی

ایک واقعہ

فکرِ دولت نہیں کریں گے کبھی
ذکرِ الفت نہیں کریں گے کبھی
دوستوں کو بھی آزما دیکھا
اب محبت نہیں کریں گے کبھی

مطلع

اگر نہیں ہی حجاب مجھ سے تو پردہ چہرہ پہ کیوں پڑا ہی
وگر ہی آنکھوں سے سب کی پردہ تو جلوہ کا ہے کو برملا ہی

قطعہ

اے شہرۂ حُسن و خوبروئی | با دلبری و بجانستانی
من بندۂ عاجزِ تو ہستم | از درگہِ خویشتن مرانی

گزارش



حضرتِ آسیِ مقدس سے ٭ تھا تلمذ دمِ ازل سے مجھے
لیک غافل تھا روِ غفلت سے ٭ فیض حاصل نہ تھا عمل سے مجھے
تھا لڑکپن سے ذوقِ شعر و سخن ٭ نہ کسی علم اور عمل سے مجھے
کیمیا کی ہوس نہ شوقِ جفر ٭ نہ کبھی تھی غرض رمل سے مجھے
نفرتِ تام تھی حقیقت میں ٭ اہلِ زر صاحبِ دُوَل سے مجھے
فقر دولت تھی دل سے تھا مرغوب ٭ جھونپڑا بہتریں محل سے مجھے
ہاں محبت تھی اہلِ دل کے ساتھ ٭ زندگانی کے ماحصل سے مجھے
شعر کہتا تھا، پر تھا خوف مدام ٭ طعن و تشنیعِ بے محل سے مجھے
نیک و بد کی مگر تمیز نہ تھی ٭ تھی نہ رغبت مے و عسل سے مجھے
شرم آتی تھی پیشِ اہلِ کمال ٭ اپنے اشعارِ مبتذل سے مجھے
اب یہ خواہش ہے فیض حاصل ہو ٭ مبدءِ فیضِ لم یزل سے مجھے

لیک ممکن نہیں ہو بے تعلیم | اپنی قوت سے اپنے بل سے مجھے
چند اشعارِ حافظِ شیراز | تھے پسند اولیں غزل سے مجھے
اُن کی تضمین کی مگر ڈر رہی | احتمالاتِ محتمل سے مجھے
ہی خبر، آپ کی علالت کی | ہی خبر، فرصتِ اقل سے مجھے
پر ہو کس طرح آگہی حاصل | شعر کے حسن اور خلل سے مجھے
ہی تمنا کہ دیجیے اصلاح | قاعدہ ہائے مستدل سے مجھے
ایسی اصلاح ہو کہ سب جانیں | اہلِ عقد اور اہلِ حل سے مجھے

میری اس نظم پر بھی ایک نگاہ
آگہی تا کہ ہو عمل سے مجھے



تضمین بر غزل آسیؔ



دردِ دل کا کچھ مداوا کیجیے　　دیدہ و دل میں مرے جا کیجیے
بوالہوس سے ترک ملنا کیجیے　　کچھ کہوں میرا جو کہنا کیجیے
چاہنے والوں کو چاہا کیجیے

جزو میں کل ہی سراسر جلوہ گر　　تھا قصور اپنی نگہ کا سر بسر
دیدۂ حق بیں سے دیکھے دیدہ ور　　ہو مسلّم وسعتِ ذوقِ نظر
قطرہ میں جب سیر دریا کیجیے

عشق و الفت کے تھے جوش و ولولے　　نوجوانی کی اُمنگ اور حوصلے
ہیں غلط عشق و محبّت کے گلے　　فتنے سب برپا کیے ہیں حسن کے
میری الفت کو نہ رسوا کیجیے

وہ مصیبت کیا جسے دل سہہ نہ جائے　　وہ لہو کیا زخم سے جو بہہ نہ جائے
سر بکف ہوں بھول تم سے رہ نہ جائے　　حوصلہ تیغِ ادا کا رہ نہ جائے

آیئے قتلِ تمنّا کیجیے

سجدہ کرتے ہیں حقیقت دیکھ کر　　　حق کا جلوہ حق کی قدرت دیکھ کر
ہوگیا میں محوِ حیرت دیکھ کر　　　کس کو دیکھا اس کی صورت دیکھ کر

جی میں آتا ہی کہ سجدہ کیجیے

وعدۂ شب، وعدۂ فردا ہوا　　　انتظارِ جلوہ ہی بحرِ فنا
رو کے کہتا ہی فدائیؔ کچھ سنا　　　راہ تکتے تکتے آسی چل بسا

کیوں کسی سے آپ وعدہ کیجیے

غیر کی بدمستیاں ہنگامِ مے　　　آپ کا وہ جوشِ الفت پے بہ پے
صبر و شکرِ عشق بازاں تا بہ کے　　　نامرادوں کا جو شکوہ تلخ ہی

کیوں کسی کی بات مانا کیجیے

تضمین

بر غزل حضرت امیر خسرو

رفتار تیری دیکھکر بھولے چلن کبک دری — رخسار سے تیرے خجل خورشید و ماہ و مشتری
سر تا قدم نامِ خدا پیدا ہی شانِ دلبری — ای چہرۂ زیبای تو رشکِ بتانِ آزری

ہر چند وصفت می کنم در حسن زان زیباتری

چتون عجب انداز کے آنکھیں غضب جادو بھری — چشمِ فسونگر سے تری باطل ہی سحرِ سامری
تونے کہاں سے ای صنم سیکھے یہ طرزِ دلبری — تو از پری چابکتری و ز برگِ گل نازکتری

وز ہر چہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری

وہ دلربا صورت تری جس کو کریں سجدہ ملک — ہر آن میں عشوہ گری ہر بات میں پیدا لچک
وہ بھولی بھالی ہر ادا اور اس میں شوخی کی جھلک — تا نقش می بندد فلک کس گزندارد این نمک

حورے ندانم یا ملک فرزندِ آدم یا پری

جادو بھری اٹکھیلیاں اک اک ادا ناز آفریں — شیریں زبان شکر دہن گل پیرہن زہرہ جبیں
ہم نے تو اس انداز کے معشوق دیکھے ہی نہیں — صورت گرِ نقاشِ چیں اَ صورتِ یارم ببیں

یا صورتے کش این چنیں یا ترک کن صورتگری

ہی یاد تیری ہر گھڑی ہر دم ہی تو پیشِ نظر آنکھوں میں پھرتی ہی ہی صورت تری آٹھوں پہر
جب سے نگاہِ شوق میں ای یار تو ہی جلوہ گر ہرگز نہ آید در نظر روے زرویت خوبتر
شمسے ندانم یا قمر یا زہرہ و یا مشتری

ہی محو تیری یاد میں ہر ساکنِ دیر و حرم جو یا ہیں تیری دید کے روم و عرب چین و عجم
میں کیا بتاؤں کیا ہی تو اس شے نیکو کی قسم آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

ہر لحظہ تیری یاد میں بڑھتی گئی وارفتگی حتیٰ کہ کچھ باقی نہیں مجھے میں او تجھ میں دوئی
مت پوچھ کیفیت ہی کیا ہوں مستِ جامِ بیخودی من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

شرحِ غم

میں ہوں کہ احباب سے مہجور و دور
خاکِ درِ رہ گزرِ جون پور

میں ہوں کہ آوارۂ دشتِ جنوں
میں ہوں کہ اک عربدۂ خاک و خوں

میں ہوں کہ بیچارہ و رنجیدہ ہوں
غمزدۂ جور و ستم دیدہ ہوں

میں ہوں کہ اک خانہ بر اندازِ دل
میں ہوں کہ اک عربدہ پردازِ دل

میں کہ مری آہ ہی وہ ناتواں
پیرزنِ خستہ کے گھر کا دھواں

میں کہ مرا نالہ ہی بے یار و کس
قافلۂ یاس میں بانگِ جرس

میں سببِ موعظتِ واعظاں
باعثِ تضحیکِ نصیحت گراں

میں ہوں وہ غافل کہ خبر کچھ نہیں
اور نصیحت کا اثر کچھ نہیں

گرم نصیحت میں جو وارفتہ ہوش
حیف نصیحت گر ما ہرزہ کوش

میں ہدفِ طعنۂ اغیار ہوں
میں نظروں میں خلشِ خار ہوں

میں ہوں کہ با ہر دو جہاں باختہ
نردِ وفا ہے تو بجاں باختہ

مجھ سے مری حالتِ مضطر نہ پوچھ
آہ گزرتی ہی جو دل پر نہ پوچھ

مجھ سے تو بے مہریِ قاتل نہ پوچھ
حسرتِ زخمِ دلِ بسمل نہ پوچھ

ای مرے خالق مری حالت ہی کیا
پر زدہ کاغذ قسمت ہی کیا

دل پہ پڑی ہی جو مصیبت نہ پوچھ
جان پر آئی ہی جو آفت نہ پوچھ

میں ہوں کہ ہوں دید کے قابل نہ پوچھ
سوز و گدازِ جگر و دل نہ پوچھ

فرصتِ بسمل بہ تپیدن دہید
باز بہ فتراک رسیدن دہید

قطعۂ تاریخ

عشق میں کچھ نام اپنا کر گیا
داغ حسرت کا دلوں پر دھر گیا

سال لکھئے از سرِ آہِ حزیں
دوست کہتے ہیں فدائی مر گیا

۱۳ ھ ۳۷

نوٹ :۔ مصنف نے یہ قطعہ تاریخ اپنے انتقال سے ایک سال قبل ۱۳۳۶ھ میں لکھا تھا اس سال انتقال نہ ہوا۔ دوسری سال ۱۳۳۷ھ میں جب وفات ہوئی تو از سرِ آہِ حزیں کو از سرِ باغِ بہشت سے بدل کر یہی قطعہ تاریخ لوحِ مزار پر کندہ کرادیا۔

مثنوی

حمد

واجب کی ثنا ہی غیر ممکن　اس گل کی ہو کس سے سیر ممکن

بیروں ہی ز فہم و وہم و ادراک　ہر عیب سے ہی منزّہ و پاک

پوشیدہ ہو کنہ ذات اُس کی　محمود ہیں کُل صفات اُس کی

تعیین و تعینات سے پاک　ہم جسم سے ہم جہات سے پاک

برتر ہی خیالِ این و آں سے　اعلیٰ ہو مکان و لامکاں سے

وہ ذاتِ قدیم لایزالی　ہی تہمتِ ابتدا سے خالی

ہرگز اُسے انتہا نہیں ہو　باقی ہی اُسے فنا نہیں ہو

معلول ہیں کل وہ علتِ کل　عارض نہیں دور یا تسلسل

اوصاف ہیں سب قدیم اور خیر　اور ذات کی عین ہیں نہ ہیں غیر

یہ قدرتِ حق کی ندرتیں ہیں　ہوجاتی ہیں مرتفع نقیضین

گر جمع ہوں دونوں غیر اور عین　عارض نہ ہو اجتماعِ ضدین

امواج ہیں عین و غیرِ دریا — امواج کی سیر سیرِ دریا

ہی حیثیتوں کا یاں تبدّل — ہو فرقِ تحقّق و تعقّل

بے چون و چرا ہی ذاتِ مطلق — بے کیف و کم صفات برحق

واحد ہی اور ہی عدد سے باہر — ہر بات ہی اُس کی حد سے باہر

علم اُس کو ازل کا اور ابد کا — خالق ہی تمام نیک و بد کا

ہر چیز ہی خیر شر ہی نابود — معدوم کو لوگ سمجھے موجود

ہو جاتا ہی خیر شرِ خاطف — جب حکمِ خدا کے ہو مخالف

کہتے ہیں اُسے حرام اور شر — بے شک ہی وہ زشت و خام اور شر

باقاعدہ گر ہو یہ تراضی — ممدوح ہی وہ بحکم قاضی

سب لوگ اسے خیر کہہ رہے ہیں — اپنے نہیں غیر کہہ رہے ہیں

ہی قتل کا فعل فطرتًا کج — ہی خیر بحکمِ قاضی و جج

اعمال وہی عمل وہی ہی — فرمانِ خدا اکابل وہی ہی

تبدیلِ محل سے حکم بدلا — برعکس عمل کے حکم بدلا

حاجت نہیں قول کی سند کی — تمیز نہیں تھی نیک و بد کی

دو حاکم بحر و بر نہیں ہیں — دو خالق خیر و شر نہیں ہیں

علم اُس کو تو جزئیات کا ہی | خالق وہی کائنات کا ہی
محدود نہیں ہی علم اُس کا | معدود نہیں ہی علم اُس کا
اوصاف ہیں اُس کے لاتناہی | کیا ہوسکے معرفت کما ہی
قدرت اُس کی کمالِ قدرت | ممکن اُس کا محالِ قدرت
سب فعل ہیں اُس کے اختیاری | ممکن ہیں بجز شریکِ باری
قادر ہی بغیرِ استعانت | کرتا نہیں پر خلافِ عادت
لیکن پئے حجتِ رسالت | اعجاز ہو اور ہو کرامت
دیکھیں گے زہے کمالِ باری | ان آنکھوں سے ہم جمالِ باری
قسمت میں نہیں ہی جن کے یہ فیض | حاصل نہیں کرسکیں گے یہ فیض
صادر نہ ہو حق کی ذات سے کذب | صادق کی کہاں صفات سے کذب
کیا منہ ہی جو لب کو کھولتا ہی | خالق کہیں جھوٹھ بولتا ہی
ایسا ہو تو اُس کے علم کا نقص | ایسا ہو تو اُس کے حلم کا نقص
وعدہ میں وفا وعید پر سخت | مخلص پہ کرم عنید پر سخت
تہمت ہی اور اتہام ہی یہ | ناحق کوشی کا کام ہے یہ
ہر نقص سے پاک ذاتِ عالی | ممدوح ہی ہر صفاتِ عالی

قرآن اُس کا کلامِ کامل (قرآن) خلقت کے لئے پیامِ کامل
بدبیں کے توہمات سے پاک تحریف و تصرفات سے پاک
انسان کو عزم کار بھی ہی کچھ جبر کچھ اختیار بھی ہی
مختار کو احتیاجِ کوشش مجبور کے فعل پر نکوہش
نیکی کرے تو ثواب حاصل غفلت کرے تو عتاب حاصل
سبحان اللہ ذات تیری (عالم الغیب) اعلےٰ ارفع صفات تیری
تو عالمِ جہر و عالمِ الغیب تو عالمِ کل علوم لاریب
جز تیرے ہی یہ خطاب کس کو جز تیرے ہی ایسی تاب کس کو
کیا اس میں بشر ہو کیا ملک ہو کیا اس میں زمین ہو کیا فلک ہو
تو جس کو سکھا دے وہ بتائے تو جس کو بتا دے وہ بتائے
لا علم لنا ہی شان میری قربان تجھ پر ہو جان میری

نعت

جز ذاتِ خدائے لایزالی سب سے افضل شریف و عالی
ہی ذاتِ مبارکِ محمدؐ دیباچۂ مطلق و مقید
سلطانِ رسل خلیفۂ حق کشافِ خطِ صحیفۂ حق

ای جانِ جہانِ آفرینش ای روح و روانِ آفرینش
ای باعثِ فخرِ آدمؑ و نوحؑ ای باعثِ خلقِ عالمِ روح
عالی نسبی میں فخرِ آدم والا حسبی میں رشکِ عالم
پرتو ہی صفاتِ حق کا تجھ میں شرافت اک سایہ ہی ذاتِ حق کا تجھ میں
ہی ذات تری شریف واعلےٰ ہی ذات تری لطیف واعلےٰ
ہی جس میں کہ جزو گوہرِ پاک ہی جس میں کہ خون جانِ لولاک
اور جس میں کہ ہیں صفاتِ عالی موجود ہیں سب جہاتِ عالی
وہ سب سے شریف اور برتر وہ سب سے لطیف اور برتر
جتنے ہی صفات میں زیادہ جتنے ہی جہات میں زیادہ
جو تیرا قریب تر وہ اشرف جو تیرا حبیب تر وہ اشرف
یاں تک کہ عرب کی سرزمیں تک مذکور ہی چرخِ چارمیں تک
ہرچند صفات اور بھی ہیں ہرچند جہات اور بھی ہیں
حُسنِ صورت ہی حُسنِ سیرت دولت حکمت سخا شجاعت
پر نسل کی اصلیت کہاں جائے نسب اور ملک کی خاصیت کہاں جائے
ہر وحش و طیور میں نسب ہی ظاہر میں ظہور میں نسب ہی

ہر پھول میں پھل میں او شجر میں
ہر سنگ میں لعل میں گہر میں

یورپ میں ہی پر تگیز میں ہی
یہ نسل تمام چیز میں ہی

آجاتی ہی جب صفت حسب کی
ہو جاتی ہی جزو وہ نسب کی

اس وجہ سے کہتے ہیں خردمند
محفوظ بنا و نسلِ فرزند

ہاں جملہ صفات کھو کے مل جائیں
گر جائے نسب تو پھر کہاں پائیں

گر نسل کا کچھ سراغ لگ جائے
دامن میں ہمیشہ داغ لگ جائے

ہر چند کہ نسل باپ کی ہی
ہر ملک کو آپ آپ کی ہی

آجاتا ہی ماں کا بھی اثر کچھ
پا جاتے ہیں اس کی بھی خبر کچھ

ہر چند کہ تخم ہو کہیں کا
ہو جاتا اثر ہی سر زمیں کا

طائف کا انار ہند میں کیوں
مکّہ کی کھجور سند میں کیوں

ویسے نہیں ہوتے ہیں سبب کیا
تخصیص مزارعِ عرب کیا

گھوڑے میں اثر تو ہو نسب کا
کہتے ہیں کہ کھیت ہی عرب کا

اور آدمی میں نہ ہو عجب ہی
حیرت ہی یہ قہر ہی غضب ہی

بد نسل کی خاصیت ہی معلوم
کم اصل کی اصلیت ہی معلوم

ہرگز نہ کریں کسی سے نیکی
ہو کیسی ہی دوستی کسی کی

گر خونِ حرام سے ہو پیدا — ناپاک قوام سے ہو پیدا
ناپاک ہی خلقتِ مُجسّم — مخلوق ہی از پئے جہنم
پھر اُس کے نسب کا پوچھنا کیا — سونے میں ہی مل گیا سُہاگا
موجود ہوں پنج عیب شرعی — بدذاتیوں کی ہو رسم مرعی
غصبِ حقِ خواہر و برادر — اوقاف کا مال شیرِ مادر
سب ہضم یتیم مال کرنا — اور سود و ربا حلال کرنا
عزت سے غرض نہ خوفِ حرمت — مذہب کی طلب نہ شرمِ خلقت
بیٹی ہو، بہو ہو، بھانجی ہو — جو چاہے کرے اُنھیں خوشی ہو
بس اُن کو ہوس کی دُادل جائے — دولت ملے جا بُدا دل جلے
مجموعہ ہو بے حیائیوں کا — جو خاصّہ ہی حرامیوں کا
اہلبیتِ مکرمت نہیں ہی — تقوےٰ کی صلاحیت نہیں ہی
جنّت میں نہ جائے گا حرامی — اور نسلِ حرام بھی تمامی
الزام نہیں ہی کچھ خدا پر — تھا روزِ ازل سے یہ مقرر
اب سمجھے گا منکرِ شرافت — کیا لطف ہی اس میں کیا لطافت
کھانا نہ فریب اور دھوکا — حضرت نے کہا ہی فخر اس کا

معراج

معراج کی رات تھی عجب رات — اللہ سے ہو گئی ملاقات

وہ پہونچے تھے اُس جگہ جہاں تک — پہونچے نہیں ہم بھی وہاں تک

وہ کنجِ خفا میں مختفی تھا — یہ جلوۂ حق کا ملتجی تھا

مذکور نہیں تھا دوسرے کا — واصل موصول سے ملا تھا

ایمان ہے آپ کی رسالت — اسلام ہے آپ کی اطاعت

دل سے ہے محبّت آپ کی فرض — ہے جان سے الفت آپ کی فرض

عصمت ہے ملائکہ کی واجب — حرمت ہے ملائکہ کی واجب

اور جتنے رسول و انبیا ہیں — خاصانِ خدائے کبریا ہیں

جتنے کہ ہیں پیشوائے ملّت — جتنے کہ ہیں اصفیائے ملّت

سب ہیں مکرّم و معظّم — سب ہیں معظّم و مکرّم

لازم ہوئی اتباعِ سنت — واجب تبعیتِ شریعت

تقلید کے قابل اور سزاوار — اصحاب کبار و آلِ اطہار

ہوں اُن پہ سلام اور صلوٰت — ہوں اُن پہ درود اور تحیات

مناقب

اوّل صدیق رضہ صاحبِ غار — دوم فاروق رضہ عدل کردار

سویم عثمانؓ حیا گزیدہ	چارم علیؓ خدا رسیدہ
ہو سب تھے بخوبی و کرامت	زینت دہِ مسندِ خلافت
عبّاسؓ اور حمزۂ مطہرؓ	عمّینِ مبارکِ پیمبرؐ
وہ بنتِ رسول اور حسنینؓ	وہ نورِ نظر وہ قرّۃ العین
وہ عشرۂ مبشرہ کے اصحاب	خورشید تھے کوئی کوئی مہتاب
انصار و مہاجرین حضرت	اصحابِ رسول پاک طینت
کفار پہ سخت تھے غضب کے	آپس میں تھے دل سے دوست سب کے
باہم جو مشاجرات تھے کچھ	آپس کے معاملات تھے کچھ
جو کچھ ہوئی غیر اعتمادی	وہ تھی غلطیِ اجتہادی
ناحق کو ہوئی تھی پیش دستی	حق والے نے کی تھی حق پرستی
ہم کون جو اس کی بحث چھیڑیں	مُردے قبروں کے ہم اکھیڑیں
یہ بحث نہیں اصولِ دیں کی	کیوں اس میں پڑیں کہ کی نہیں کی
ہم کرتے ہیں اس کو ختم اس پر	جائز نہیں سب و شتم اس پر
یہ درسِ رضا کا اک سبق ہے	وہ حق سے ہیں خوش خوش اُن سے حق ہے
خونیں کفنانِ کربلا پر	اولادِ حبیبِ کبریا پر

اعدا نے کیئے تھے جور و بیداد — اللہ دلائے حشر میں داد
مہدی موعود ہوں گے پیدا — وہ صاحب جود ہوں گے پیدا
وہ ہادی و مہدی ہدایت — وہ جانِ امامت و خلافت
وہ حامی دین و قوم و ملّت — وہ ماحیِ کفر و شرک و بدعت
پیدا ہوں گے عروج ہو گا — تب دشمنوں پر خروج ہو گا
گر تم کو ملیں امامِ آخر — پہونچانا میرا سلام آخر
یا رب مجھے شرک سے بچانا — سیدھا رستہ مجھے دکھانا
عاصی ہوں گناہگار ہوں میں — رحمت کا امیدوار ہوں میں
شرمندہ و شرمسار میں ہوں — اک رحم کا خواستگار میں ہوں
خالق تو ہی تجھی سے مانگیں — رازق تو ہی تجھی سے مانگیں
پیروں سے مدد کا مانگنا کیا — قبروں سے مدد کا مانگنا کیا
مُردوں سے مدد کا مانگنا کیا — غیروں سے مدد کا مانگنا کیا
اللہ بچائے بدعتوں سے — اسلام کے دیں کی برکتوں سے
بدعت کی بہت ہوئی ہے کثرت — اور شرک کی ہوگئی ہے عادت
جلسے سالانے ہو رہے ہیں — مستی کے ترانے ہو رہے ہیں

اصحاب نشاط گرم صحبت — ارباب نشاط گرم صحبت

قلاش تمام آرہے ہیں — جلسے میں عوام آرہے ہیں

اوباش بھی جمع ہو رہے ہیں — عیاش بھی جمع ہو رہے ہیں

قوال الگ تھرک رہے ہیں — طبلے وہ الگ ٹھنک رہے ہیں

کہتے ہیں کہ پیر مانتے ہیں — کہتے ہیں فقیر مانتے ہیں

اک مکر کا ضابطہ نکالا — پیروں کا جو واسطہ نکالا

یہ جھوٹ فریب ہے سراسر — کرتی نہیں اس کو عقل باور

مطلوب اگر تھا فیض پانا — مقصود تھا واسطہ دلانا

حضرت کا وہ واسطہ دلاتے — ملّت کا وہ واسطہ دلاتے

موسیٰؑ کا وہ واسطہ دلاتے — عیسےٰ کا وہ واسطہ دلاتے

اللہ سے مانگتے مرادیں — قبروں سے نہ چاہتے مرادیں

حاجت کوئی اُن کو مانگنا ہو — تب قبر کا جاکے سامنا ہو

اُس قبر کو جاکے چومیں چاٹیں — سجدہ کریں اور فتوح بانٹیں

بیٹا کوئی اُن سے مانگتا ہے — جورو کوئی اُن سے چاہتا ہے

کہتا ہے کوئی یہ اپنا قصّہ — دینا نہ پڑے بہن کا حصّہ

ایک ایک غرض میں مبتلا ہے بدعت کے مرض میں مبتلا ہے
مانا ہیں بزرگ صاحب قبر مانا ہیں سترگ صاحب قبر
عزت ہی تو روح پاک کی ہے یا بدعتِ شرمناک کی ہے
جو فعل کہ مزخرف نہیں ہے جو امر کہ مختلف نہیں ہے
کرتے نہیں کیوں وہ امر دینی جس کا کہ ثواب ہی یقینی
راتوں کو کریں نہ آہ وزاری حق سے نہ کریں اُمیدواری
کعبہ میں نہ جائیں مُدّعا کو مسجد میں نہ جائیں وہ دعا کو
حاصل نہ کریں حلال روزی سوچیں نہ کبھی مال روزی
واجب ہی زکوٰۃ پر نہ دیویں خیرات میں مال وزر نہ دیویں
حج فرض ہو پر اُدھر نہ جاویں سو حیلے ہزار عذر لاویں
تسبیح سے لیتے ہیں وہ سو کام ہی پھانسنے کو یہ دانہ و دام
تسبیح امام ہی ریا کی دشمن ہی یہ زہد واتقا کی

تسبیح نہ کام آئے اصلا
یہ تنبو میں کرے گی تم کو رُسوا

دعویٰ ہی کہ اہل دید ہیں ہم دعوے ہی کہ بایزید ہیں ہم

احناف کی پیروی کا دعویٰ — اسلاف کی پیروی کا دعویٰ

یہ سب افعال ہیں منکر — یہ سب اعمال ہیں منکر

بتلاؤ کہاں ہدایہ میں ہے — بتلاؤ کہاں کفایہ میں ہے

شامی میں کہاں لکھا ہوا ہے — قاضی میں کہاں لکھا ہوا ہے

کس نسخہ میں ہے ذرا دکھاؤ — کس صفحہ پہ ہے بھلا دکھاؤ

ہم بھی حنفی ہیں اہلِ تقلید — بتلاؤ کہاں ہے اس کی تاکید

دیکھو تو کہیں قدوری میں ہے — یا آپ ہی کی حضوری میں ہے

تقلید کروگے صوفیوں کی — لاؤگے سند فضولیوں کی

قرآن و حدیث سے سند لاؤ — اقوال صحیح و مستند لاؤ

شبلی و جنید کی سند دو — فرمودہ با یزید لاؤ

مذہب کے ہیں حیلے اور بہانے — بدستیوں کے ہیں کارخانے

جو کچھ کہ جناب کر رہے ہیں — خلقت کو خراب کر رہے ہیں

مذہب کہکر کریں جو چاہیں — مخلوق کے ساتھ گر نباہیں

جو عیب کریں سے کہے نہ کوئی — خاطر میں ہے اُن کے گر نکوئی

جتنے کہ ہیں باطلہ مذاہب — سب میں ہے یہی خیال غالب

ای قوم کے پیشوا ذرا شرم — ای قوم کے رہنما ذرا شرم
اللہ و رسول سے ذرا شرم — اولادِ بتول سے ذرا شرم
معلوم ہی شرک ہی بڑا جرم — اس سے نہیں بڑھکے دوسرا جرم
وعدہ ہی نہیں خلاف ہوگا — یہ جرم نہیں معاف ہوگا
توبہ کے سوا نہیں ہی چارہ — ورنہ ہی تمام تر خسارہ
توبہ کی ہوس دماغ ہیں دے — یہ نور میرے چراغ ہیں دے

توبہ کروں بار بار توبہ
توبہ توبہ ہزار توبہ

معبود نہیں سوا سے باری خطبۂ ثانی باجملہ صفا تہائے باری

ہو اُس سے کوئی صفت نہ معدوم — لازم ہیں صفات اور ملزوم
مستجمع کل صفاتِ محمود — خالق ہی وہی۔ وہی ہی معبود
سجدہ اُس کے لیے محقق — اوروں کے لیئے حرام مطلق
مخصوصِ خدا رکوع و سجدہ — خاص اُس کے لیئے خضوع و سجدہ
یا جس کے لیئے خدا کا فرمان — انکار کرے تو ہو وہ شیطان
مسجود ملائکہ اور آدم — محسود ملائکہ اور آدم

سجدہ نہیں تھا وہ امتحاں تھا　　فرمان خدائے انس و جاں تھا

اقرارِ رسالتِ محمّدؐ
ہی کلمۂ حق کا قفلِ ابجد

خاتمہ

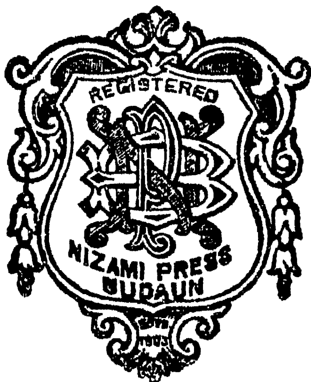
نقشِ مشاطۂ عجوزہ　　ہی حاصلِ فکرِ چار روزہ
داماد زمانہ بس ہی عنیں　　کب بکرِ سخن کو دے وہ کابین
تحسیں سے غرض نہ نام سے کام　　ہم کو تو فقط ہی کام سے کام

کر شکر خدا کہ ہی وہ برتر
اعلےٰ اولےٰ اتمّ و اکبر



تصحیح اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
		مقدمہ	
۵	۱۱	بستکر	بستنکر
۵	۱۵	ایگنزیزی	انگریزی
۶	۶	تکت	تک
۸	۹	ہنیں رہا	ہنیں ہی
۱۴	۱۲	پلند پائیگی	بلند پائگی
۱۵	۱۰	وقتِ	وقفِ
۲۵	۱۲	بیان کرنے	بیان کرتے
۳۱	۳	کارگرافتاد	کارگرافتاد
۳۸	۱۱	کے ساتھ مجالست	کی مجالست
۴۳	۱۴	اور دیکھئے	اور دیکھیے
۴۴	۶	روح کھنچکر	روح کھینچکر
۴۵	۴	بہشث	بہشت
		دیوان	
۲	۵	بدمستان مخفلہا	بدمستان محفلہا
۱۴	۶	عشق نام است	عشق نام است
۶۵	۱۰	طالب علم	طالب علم


REGISTERED
NIZAMI PRESS
BUDAUN